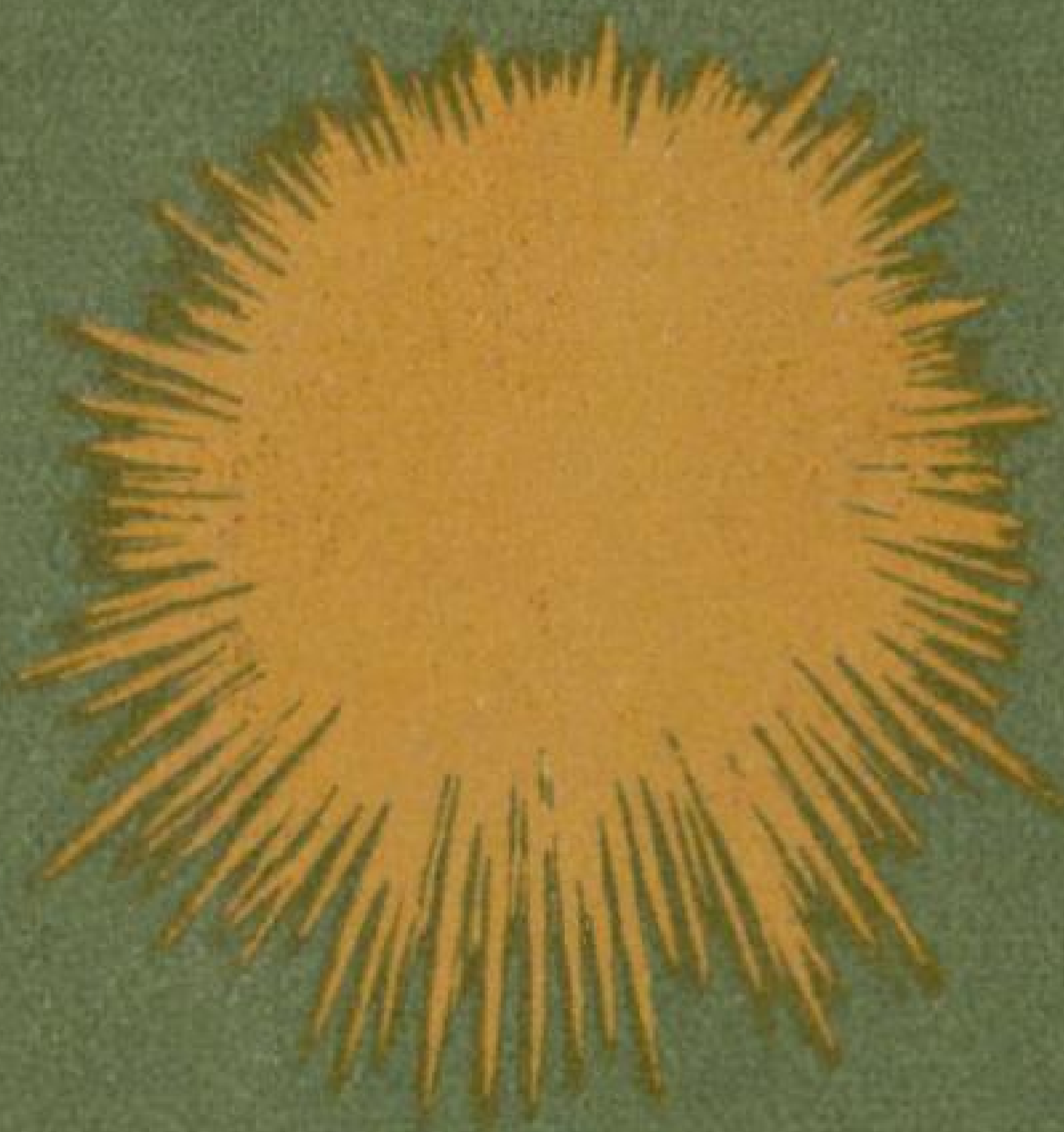
سید ابوالاعلیٰ مودودی



اسلام کا سرچشمۂ قوت

ایوانِ ادب چوک اُردو بازار، لاہور

اسلام کا سرچشمۂ قوت

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مرتب

شہیر نیازی

ناشر

ایوانِ ادب چوک اردو بازار، لاہور

طبع اول : اگست ۱۹۶۹ء

قیمت : دو روپے پچیس پیسے

کتابت : محمد ریاض خاں

عمل سرورق : اقبال ظفر اللہ

طباعت : ونڈائک آفسیٹ

مطبع : کنول آرٹ پریس، لاہور

سرورق : نصرت پریس، لاہور

اہتمام : حفیظ احسن ایم-اے



ناشر:- ایوانِ ادب، چوک اُردو بازار، لاہور

فہرستِ مضامین

حصّہ اوّل

پہلا باب

دُوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

حصۂ دوم

۱۔ اِسلام پر کفر کی یورش کے اسباب ۸۱،

۲۔ تدابیرِ دفاع ۸۹،



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

سال ۷۰۰ بعد

ملتِ اسلامیہ نے گزشتہ دو سو سال میں مغربی تہذیب کے ہاتھوں بہت سے زخم کھائے ہیں۔ اس تہذیب کی اخلاق باختہ حریتِ فکر کے علمبرداروں اور تحقیق و انکشاف کے مدعی شمشیر بستہ حملہ آوروں کے مقابلے میں یہ ملت جس انتشار اور ہزیمت و شکست خوردگی کی کیفیت سے دوچار ہوئی ہے وہ اس کی تاریخ کا ایک اندوہناک باب ہے۔ ایک ایسا باب جو مقامِ نوحہ و ماتم بھی ہے اور محلِ عبرت بھی!

اس اندوہناک باب کے اوراق سارے عالمِ اسلام میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔

گزشتہ صدی میں اسی اَلَم انگیز صورتِ حال پر ایک دردمند دل کی دھڑکنیں ان الفاظ میں ڈھل گئی تھیں:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

(حالیؔ)

اور جب اسی دل دردمند نے اقبال کی جانِ ناصبور کا روپ دھارا ـــــــ تو ملتِ اسلامیہ کا یہ غم اُس کے سوزِ خودی میں ڈھل کر ان الفاظ میں منعکس ہوا:

ٍ نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ۔۔۔ ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کیلئے

آخر اس جانِ ناصبُور کا سوزِ آرزو رنگ لایا اور اُس نے ایک ایسے قلم کا پیکر اختیار کیا جس میں پھول کی نزاکت بھی تھی اور ہیرے کی صلابت بھی، — طبیب کے مرہم کی سکینت بھی تھی اور مجاہد کی تلوار کی — کاٹ بھی!

یہ عہد ساز قلم گزشتہ نصف صدی سے:

مِلّتِ اسلامیہ کو اس کے مقصدِ وجود کا بھُولا ہوا سبق یاد دلا رہا ہے۔

یہ قلم مِلّتِ اسلامیہ کو اس کی گزشتہ عظمتوں اور رفعتوں سے رُوشناس کر کے اُن کا امانتدار بنانے کی حیات آفریں خدمت سر انجام دے رہا ہے۔

یہ قلم ایک حیرت انگیز اعتماد اور معجزانہ استقامت کے ساتھ مغربی تہذیب اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والے افکار و نظریات کا تار و پود بکھیر رہا ہے۔

یہی قلم آج اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور تہذیبِ حاضر کی ہزیمت اور ناکامی کی علامت بن گیا ہے!

یہ قلم مفکرِ اسلام مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا قلم ہے!

اُن کے عہد ساز قلم نے اسلامی لٹریچر میں ایک عظیم الشان اور گرانقدر ذخیرے کا اضافہ کیا ہے اور اردو ادب کو علمی اور فکری سرمائے سے مالا مال کر دیا ہے۔

لاریب اس صدی میں دینِ اسلام کی جرأت مندانہ ترجمانی اور عہدِ حاضر کے باطل افکار و نظریات کے مقابلے میں اس کی آبرومندانہ مدافعت کا یہ غیر معمولی کارنامہ جو نصف صدی پر محیط ہے، ایک ایسا اعزاز ہے جو اس برّصغیر کی گزشتہ تاریخ میں اور عالمِ اسلام کے موجودہ دو سو سالہ دورِ ابتلاء میں کسی دوسری ہستی کو حاصل نہیں ہُوا!

ساٹھ سے زائد عظیم الشان علمی و تحقیقی اور عہد آفرین کتابوں کا مصنّف اور

ٍ : ان میں سے بیشتر کتابوں کے تراجم دُنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کی مقبولیت صرف عالمِ اسلام

برِ صغیر کی موجودہ تحریکِ اسلامی کا بانی و قائد، دین و ملّت کی پچاس سالہ خدمت کا ایک ایسا اعزاز اپنے دامن میں رکھتا ہے جس نے اُسے عالمِ اسلام کی اُمید اور ملّتِ اسلامیہ کی آنکھ کا تارا بنا دیا ہے:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

پیشِ نظر کتاب "اسلام کا سرچشمۂ قوّت" عالمِ اسلام کے اِسی بطلِ جلیل کی اب سے ۴۴ سال پہلے کی تصنیف ہے۔ اِس کتاب کا تعلّق اُس زمانے سے ہے جب موصوف ایک نوعمر[1] صحافی کی حیثیت سے چار سال تک "تاج" جبلپور (۱۹۲۰ء) اور "مسلم" دہلی (۲۱-۱۹۲۳ء) کی اِدارت کے فرائض انجام دے چکے تھے اور "الجمعیۃ" دہلی (۱۹۲۵ء) کے تنہا ذمہ دار ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ یہ کتاب ایک مسلسل اداریے کی شکل میں لکھی گئی تھی جو "اسلام کی قوّت کا اصلی سرچشمہ" کے عنوان سے الجمعیۃ کے ۱۸، ۲۲، ۲۶، اور ۲۹ جولائی اور ۱۰، ۱۴، اور ۱۸ اگست ۱۹۲۵ء کے شماروں میں اشاعت پذیر ہوتا رہا۔ ۴۴ سال تک یہ مضمون الجمعیۃ کے پرانے فائلوں میں دفن رہا اور اب اسے پہلی مرتبہ کتابی پیرایہ میں پیش کرنے کا شرف "ایوانِ ادب لاہور" کو حاصل ہو رہا ہے۔

یہ تاریخی کتاب پیش کرتے ہوئے ہمارے دل خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں سپاس و تشکر کے جذبات سے لبریز ہیں۔

اب تک "الجہاد فی الاسلام" کو مولانا کی پہلی باقاعدہ تصنیف کی حیثیت حاصل ہے (جس کا سنِ تصنیف و اشاعت ۱۹۲۷ء ہے) لیکن اب بجا طور پر امید کی جا سکتی ہے کہ "اسلام کا سرچشمۂ قوّت" کی اشاعت پر زمانی اعتبار سے اسی کو مولانا کی اوّلین تصنیف تسلیم کیا جائے گا، اس سے قطعِ نظر کہ اس کی اشاعت سنِ تصنیف کے ۴۴ سال

ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ [1] بہ عمر ۲۲ سال (سنِ پیدائش ۱۹۰۳ء)

بعد ہو رہی ہے۔

ناظرین کے لیے یہ امر ایک خوشگوار حیرت کا موجب ہوگا کہ ان دونوں کتابوں کی تصنیف میں ایک ایسا فطری تسلسل اور معنوی ربط پایا جاتا ہے جو اِن کے پہلو بہ پہلو مطالعے سے بالکل عیاں طور پر سامنے آجاتا ہے ـــــ مزید برآں واقعاتی طور پر ان کتابوں کی تصنیف کے فوری محرکات میں بھی ایک نام قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے ـــ اور وُہ ہے ہندوستان میں شُدھی کی تحریک کے بانی "سوامی شردھانند" کا نام ـــــ

مولانا نے "الجہاد فی الاسلام" کی طبعِ اوّل کے دیباچے میں اس کی تصنیف کے محرکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

"لیکن دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے مشکلات سے قطعِ نظر اقدامِ عمل پر مجبور کر دیا۔ یہ واقعہ شُدّھی کی تحریک کے بانی سوامی شردھانند کے قتل کا واقعہ تھا، جس سے جہلاء اور کم نظر لوگوں کو اسلامی جہاد کے متعلق غلط خیالات کی اشاعت کا ایک نیا موقع مِل گیا۔"

اور "اسلام کا سرچشمۂ قوّت" اُس وقت لکھی گئی جب (۱۹۲۵ء میں) اسی سوامی شردھانند کی شُدّھی کی تحریک سے مُسلمانوں میں کھلبلی مچی ہُوئی تھی اور اِس بات کا عام چرچا ہو رہا تھا کہ اِس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

اُمید ہے کہ نصف صدی گزر جانے کے باوجود کتاب کے مباحث کی تازگی، مصنف کے اسلوب کی رعنائی اور اُس کے افکار کی رفعت وعظمت کو اہلِ نظر اُسی طرح خراجِ تحسین

پیش کریں گے جس طرح وہ اب سے ۴۴ سال پہلے اس کی اشاعت پر پیش کرتے۔ راقم الحروف خود کو اس کتاب پر کسی نقد و تبصرہ کا اہل نہیں سمجھتا لیکن ایک قاری کی حیثیت سے اُسے جس چیز نے ایک گونہ اِستعجاب کی کیفیت سے دوچار کیا ہے وہ صاحب کتاب کا حیرت انگیز فکری تسلسل ہے جو اب سے نصف صدی پہلے کی اس تصنیف اور اب تک کی دیگر تصانیف کے درمیان ایک روشن خطِ مستقیم کی طرح جگمگا رہا ہے ـــــ راقم الحروف کا تاثر یہ ہے کہ فکری طور پر ایسی منضبط شخصیت اور ایسا مربوط ذہن دُنیا کے عظیم ترین مفکّروں میں بھی کسی کو کم ہی میسّر آیا ہوگا۔ یہ فکری یکسوئی اور "شانِ حنیفی" یقیناً خُدا کے دینِ برحق کا فیض بھی ہے اور خالقِ حقیقی کی شانِ کریمی کا خاص انعام بھی، جس انعام سے وہ اپنے اُن بندوں کو نوازتا ہے، جن سے اُسے اپنے دین کی کوئی خاص خدمت لینا ہوتی ہے۔

اِس فکری تسلسل کے شواہد مولانا کی تصانیف کے ہر صفحے پر بکھرے ہوئے ہیں اور وہ ان کے کسی خوش ذوق قاری کی نظر سے اوجھل نہیں ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے اس کتاب کے آخر میں مولانا کی ۱۹۶۷ء کی ایک تقریر کا اقتباس دیا جا رہا ہے جس کے مطالعے کے بعد وہ اس نادرِ روزگار شخصیت کی حیرت انگیز فکری یکسوئی پر بیساختہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا

چند باتیں، کتاب کی ترتیب و تدوین کے بارے میں:

مرتّبِ کتاب جناب شہیر نیازی صاحب نے کتاب کا مسوّدہ مکمل شکل میں اب سے کافی عرصہ پہلے راقم الحروف کو دے دیا تھا لیکن اسے خوشنویس کے سپرد کرنے سے پہلے یہ محسوس ہُوا کہ ترتیب و تدوین کے نقطۂ نظر سے ابھی اس میں مزید کام کی خاصی گنجائش موجود ہے چنانچہ اسی چیز کے پیشِ نظر: ـــــ (۱) کتاب کے اصل متن پر ضمنی عنوانات کا اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ

طویل مضامین کو پڑھتے ہوئے ان کے جملہ مباحث قاری پر بخوبی عیاں ہو جائیں اور انھیں ذہن میں تازہ رکھنے میں بھی سہولت ہو۔

(۲) ضروری مقامات پر کتاب کے حاشیے میں وضاحتی اشارات کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ حالات کے تغیر کی وجہ سے متن کے بارے میں کوئی الجھن محسوس نہ ہو ۔۔۔ بعض توضیحات خالص علمی نوعیت کی ہیں۔ امید ہے کہ یہ توضیحات قارئین کے لیے عام علمی افادیت کا باعث ہوں گی۔

(۳) متن کی قرآنی آیات کے حوالے اور حسب ضرورت ان آیات کے تراجم بھی شامل کتاب کر دیے گئے ہیں۔

(۴) کتاب کے آخر میں دو اشاریے بڑھائے گئے ہیں۔ پہلا اشاریہ اشخاص اور اداروں کے اسماء پر مشتمل ہے اور دوسرا مقامات کے ناموں پر۔ دونوں اشاریوں کے سلسلے میں راقم الحروف مجتبیٰ نواز احمد ملک صاحب کی مخلصانہ معاونت کا تہ دل سے ممنون ہے۔

(۵) اس مختصر سی کتاب میں مبلغین اسلام کی تبلیغی مساعی کے ضمن میں بے شمار اشخاص اور مقامات کا ذکر آیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی روزنامہ اخبار میں ایسے علمی مضامین کا کتابت کی غلطیوں سے محفوظ رہنا ایک امر محال ہے۔ اس لیے اشخاص اور بالخصوص مقامات کے ناموں کی صحت کا اطمینان کرنا ایک بڑا نازک مرحلہ تھا۔ راقم الحروف نے اپنے وسائل کی حد تک ان ناموں کی تحقیق کی مقدور بھر کوشش کی ہے اور حسب ضرورت حاشیۂ کتاب میں ان کو انگریزی حروف میں بھی درج کر دیا ہے۔ بایں ہمہ اہل علم حضرات کی خدمت میں یہ التماس ہے کہ اگر وہ کسی جگہ کوئی فروگزاشت پائیں تو اس سے مطلع کر کے ممنون فرمائیں تاکہ طبع ثانی کے موقع پر اس کی تصحیح کی جا سکے۔

العاجز: حفیظ الرحمن احسن (مہتمم ایوانِ ادب)

(۲۵ جولائی ۱۹۶۹ء)

تعارف

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ۔

اَمَّا بَعْد — یہ مختصر سی کتاب میرے محترم سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اُن شذرات کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے ۱۹۲۵ء میں روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی کے مُدیر کی حیثیت سے لکھے تھے۔ اُس وقت اُن کی عمر تقریباً بائیس سال تھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں ایسے سنجیدہ اور ٹھوس علمی مضامین لکھنا یقیناً غیر معمولی بات ہے۔ ان مضامین کے بارے میں جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے مَیں ایک غیر جانبدار ناقد کی حیثیت سے ان کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ سید صاحب نے جب یہ مضامین لکھے تھے تو وُہ صرف ایک صحافی تھے لیکن آج وُہ ایک بلند پایہ عالمِ دین اور معروف رہنما بھی ہیں۔ اُن کی کسی بات کو پسند یا ناپسند کرنے میں لوگوں کے ذاتی اَور نظریاتی اتفاق یا اختلاف کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ مگر مَیں تو صرف علمی دُنیا کا آدمی ہُوں اَور سید صاحب سے میرے تعلقات قطعی طور پر ذاتی اَور غیر سیاسی ہیں، اس لیے کسی مصلحت اَور جانبداری سے قطعِ نظر مَیں سمجھتا ہوں کہ سید صاحب نے اِس سلسلۂ مضامین میں اسلام کی قوّت کے اصلی سرچشمہ کی بالکل صحیح نشان دہی کی ہے۔

میرے نزدیک ان مضامین کی اشاعت کئی پہلوؤں سے اہم ہے:

۱۔ ایک تو یہ کہ ۱۹۲۵ء کے 'الجمعیۃ' کے پرچے اب بالعموم نایاب ہیں اَور ان مضامین تک عام لوگوں کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

۲۔ دُوسرے یہ کہ یہ مضامین اپنی عام اور دینی افادیت کے علاوہ اُن اداروں کے لیے خاص طور پر مفید ہیں جو تبلیغِ اسلام کے لیے کوشاں ہیں۔

۳۔ تیسرے یہ کہ یہ مضامین خود مصنّف کے ذہنی اور فکری ارتقاء کے ابتدائی نقوش کو سمجھنے کے لیے ایک قیمتی تاریخی مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

زیرِ نظر سطور میں ان مضامین کی قدر و قیمت کے متعلق کسی تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں اس امر کا فیصلہ اس کتاب کا ہر قاری خود کر سکتا ہے۔ البتّہ جو بات مرتب کی حیثیت سے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان مضامین کا ضائع ہونا علمی دنیا کا ایک نقصان تھا۔ اس لیے میں نے ان کو محفوظ کرنے کا اہتمام کر دیا ہے۔

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ میں نے اس کتاب میں جن شذرات کو جمع کیا ہے وہ بحیثیت مضمون شائع نہیں ہوئے تھے بلکہ ایک مسلسل اداریہ کی شکل میں لکھے گئے تھے۔ اس لیے اُن کو مرتّب کرنے اور اُن کا تسلسل قائم رکھنے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ بہر حال میں نے ان کو کسی ردّ و بدل کے بغیر مُرتّب کیا ہے اور صرف "گذشتہ اشاعت میں ہم نے لکھا تھا" جیسے فقرے حذف کر دیے ہیں۔

آخر میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پوری طرح سے ادا کریں تاکہ ہم میں سے ہر فرد مُبلّغِ اسلام بن جائے اور غیر مسلم ہماری سیرت اور کردار سے متاثّر ہو کر اسلام کے سر چشمۂ ہدایت سے فیض یاب ہونے کی طرف متوجّہ ہوں۔ آمین

شہیر نیازی

سعود آباد ــــ کراچی ۲۷

۱۳ فروری سنہ ۱۹۶۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

مسلمانوں کا ذوقِ تبلیغ

جب سے بعض نومسلم قوموں میں ارتداد کی وبا پھیلی ہے ہندوستان[1] کے مسلمانوں میں عام ہلچل مچ گئی ہے اور ہر طرف سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی آواز بلند ہونے لگی ہے۔ مختلف جماعتیں اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی بساط کے مطابق دعوتِ دینِ حق کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ اخبارات و رسائل میں اس کی اہمیت پر گرما گرم بحثیں جاری ہیں۔ وسائلِ تبلیغ کی تحقیق کے لیے مجلسیں منعقد ہو رہی ہیں اور فی الجملہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں درحقیقت کوئی ذوقِ تبلیغ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن جب ہم اس مسئلہ پر غائر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم آج کل کے مسلمان اُس ذوقِ تبلیغ سے بالکل ہی ناآشنا ہیں جو کسی زمانے میں اسلام کی فاتحانہ فتوحوں کا ضامن اور اُس کی عالمگیری اور جہاں کشائی کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار تھا۔ اگر آج ہمارے

---

[1] غیر منقسم ہندوستان مراد ہے (سنہ ۱۹۲۵ء میں)

اندر وہی ذوق موجود ہوتا تو شاید ان کانفرنسوں اور مجلسوں کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، اور اغیار کی چیرہ دستیوں سے ہمارے گھر میں ماتم بپا ہونے کے بجائے خود اغیار کے مجمع میں ہمارے مذہب کی بڑھتی ہوئی قوّت سے کھلبلی مچی ہوئی ہوتی بعض وقت جب ہم غور کرتے ہیں کہ یہ اُس مذہب کے پیروؤں کی چیخ پکار ہے جس کے عناصرِ ترکیبی میں دعوت الی الخیر اور تبلیغ دینِ الٰہی کا فرض ایک لازمی عنصر کی حیثیت سے شامل تھا، جس کے داعیؐ نے اپنی ساری زندگی خدا کا آخری پیغام اُس کے بندوں تک پہنچانے میں صرف کر دی تھی اور جس کے مقدّس پیروؤں نے ایک صدی کے اندر اندر بحرالکاہل کے کناروں سے لے کر بحرِ اوقیانوس کے ساحل تک کلمۂ حق کی اشاعت کر دی تھی تو ہم حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آیا یہ وہی مذہب ہے یا ہم مسلمانوں نے بنی اسرائیل کی طرح اپنے پیغمبر کے بعد کوئی اور نیا مذہب بنا لیا ہے۔

ہماری زبانوں پر تبلیغ تبلیغ کا وِرد جاری ہے اور ہم تبلیغ کے لیے انجمنیں بنا کر اسلام کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں مگر شاید یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ اُس کے پیروؤں نے عیسائیوں کی طرح مشنری سوسائٹیاں بنانے کی کوشش کی ہے، یا اِس بے تابی کے ساتھ تبلیغ کا شور مچایا ہے۔ اگر کامیابی کا حقیقی راز صرف انجمن سازیوں اور شور و شغب میں ہوتا تو یقیناً ہماری ترقی کی رفتار ہمارے اسلاف سے زیادہ تیز ہونی چاہیے تھی لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ساز و سامان کو لے کر ہمارا ہر قدم پیچھے اُٹھ رہا ہے اور اُس بے سامانی کے عالم میں ہمارے اسلاف کی کامیابیوں کا یہ عالم تھا کہ اُن کی بدولت آج دُنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کے پیرو موجود ہیں اور خود ہندوستان میں ہماری تعداد

ساٹھ کروڑ تک پہنچی ہوئی ہے۔ پھر آخر سوچنا تو چاہیے کہ ہم میں کس چیز کی کمی ہے اور اشاعتِ اسلام کا اصلی راز کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ آج یہ جتنی کمزوریاں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی ہیں سب صرف اس لیے ہیں کہ ان میں سے اسلامی روح نکل گئی ہے اور وہ بھول گئے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ کیا ہیں۔ اگر وہ اسلام کو سمجھ لیں اور انھیں معلوم ہو جائے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اور اس کا نصب العین کیا ہوتا ہے تو یہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے۔

مسلمان کا مقصدِ وجود

پروفیسر میکس مُلّر MAX MULLER کے بقول اسلام دراصل ایک تبلیغی مذہب ہے جس نے اپنے آپ کو تبلیغ کی بنیادوں پر قائم کیا، اسی کی قوت سے ترقی کی اور اسی پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔ اسلامی تعلیمات پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اگر کسی چیز کا نام ہے تو وہ صرف دعوتِ حق ہے، اور مسلمان کی زندگی کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ صرف **امر بالمعروف** اور **نہی عن المنکر** ہے۔ قرآنِ حکیم میں مسلمان کا مقصدِ حیات یہ بیان کیا گیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران : ۱۱۰)

ف یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ اب تو برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آبادی کم و بیش سترہ کروڑ ہو چکی ہے۔

اور دُنیا کے لیے اُس کے وجود کی ضرورت صرف یہ ظاہر کی گئی ہے کہ :

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ (آل عمران : ۱۰۴)

اُسے جگہ جگہ حکم دیا گیا ہے کہ :

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل : ۱۲۵)

اور : فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ۝ (قٓ : ۴۵)

اور : فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ (الغاشیۃ : ۲۱)

یہی تعلیم تھی کہ جس کا اثر رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی زندگی پر سب سے زیادہ غالب تھا اور اسی نے حضرات صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کو بالکل بدل دیا تھا۔ ان کی مقدس زندگیاں عبارت تھیں صرف دعوت و تبلیغ سے اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، غرض ہر کام اپنے اندر یہ معنوی مقصد پوشیدہ رکھتا تھا کہ خدا کی طرف لوگوں کو بلائیں اور اللہ کے بندوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کریں۔

جب تک مسلمانوں میں قرآنِ حکیم اور اُسوۂ رسولؐ کی ان تعلیمات کا اثر باقی رہا اُس وقت تک ہر مسلمان کی زندگی ایک مبلّغ اور داعی کی سی زندگی رہی۔ انھوں نے صنعت، تجارت، زراعت، حکومت اور دُنیا کے سارے کام کیے مگر دل میں یہ لگن رہی کہ اسلام کی جو نعمت خدا نے ان کو عطا کی ہے اُس سے تمام بنی نوعِ انسان کو بہرہ مند کرنے کی کوشش کریں۔ وہ حقیقتاً اسلام کو دُنیا کے لیے بہترین نعمت سمجھتے تھے اور اس لیے ان کا ایمان تھا کہ ہر انسان تک اس نعمت کو پہنچانا اُن کا فرض ہے جو شخص جس حال میں تھا اُسی حال میں وہ یہ فرض انجام دیتا تھا۔ تاجروں نے

تجارت کے کام میں، مُسافروں نے اپنے سفر کے دوران میں، قیدیوں نے اپنے قید خانوں میں، مُلازموں نے اپنے دفتروں میں اور مزارعوں نے اپنے کھیتوں میں یہ مُقدّس خدمت انجام دی۔ اور یہ ذوق اس حد تک ترقی کر گیا کہ عورتوں تک نے نہایت مُستعدی اور سرگرمی کے ساتھ اِسلام کی تبلیغ کی۔

اِسلام کی قوّت کا اصلی سرچشمہ

یہی ذوق حقیقتاً اِسلام کی قوّت کا اصلی سرچشمہ تھا۔ آج جو دُنیا میں چالیس کروڑ مُسلمان[٭] نظر آرہے ہیں اور دُنیا کی مُختلف نسلوں، مُختلف قوموں اور مُختلف مُلکوں پر اسلام کی حکومت قائم ہے وُہ صرف اسی ذوقِ تبلیغ کا نتیجہ ہے۔

اِسلام کے دُشمن کہتے ہیں کہ اس کی اشاعت صرف تلوار کی رہینِ منّت ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ وُہ صرف تبلیغ کی منّت پذیر ہے۔ اگر اس کی زندگی تلوار پر ہی منحصر ہوتی تو وُہ تلوار ہی سے فنا بھی ہو جاتی؛ اور اب تک تلوار سے اُس پر جتنے حملے ہُوئے ہیں وُہ اسے فنا کر دینے میں قطعاً کامیاب ہو جاتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات اس نے تلوار سے مغلوب ہو کر تبلیغ سے فتح حاصل کی۔ ایک طرف بغداد میں قتلِ عام جاری تھا اور دُوسری طرف سمارا میں اسلام کے

٭ یہ اندازہ ۱۹۳۵ء کا ہے۔ اب تو دُنیا میں مُسلمانوں کی آبادی تقریباً دوگنی ہو چکی ہے۔ (نیازی)

حکومت قائم ہو رہی تھی۔ ایک طرف قرطبہ (اندلس) سے اسلام مٹایا جا رہا تھا اور دوسری طرف جاوا میں اس کا علَم بلند ہو رہا تھا۔ ایک طرف صقلیہ سے اُسے ختم کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف جاوا میں اس کو ایک نئی زندگی حاصل ہو رہی تھی۔ ایک طرف تاتاری اس کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے اور دوسری طرف وہ خود اُن کے دلوں کو فتح کر رہا تھا۔ ایک طرف ترک اُسے غلامی کا طوق پہنا رہے تھے اور دوسری طرف خود ان کے دل اپنے آپ کو اس کی غلامی کے لیے پیش کر رہے تھے۔

اگر یہ اس کی تبلیغ کی فتح نہیں تھی تو اور کیا تھی؟ آج اسلام کی وہ فتوحات جنھیں شمشیری فتوحات کہا جا سکتا ہے دنیا سے مٹ چکی ہیں۔ اسپین فنا ہو چکا، صقلیہ مٹ گیا، یونان تباہ ہو گیا، مگر وسط افریقہ، جاوا، سماٹرا، چین اور جزائر ملایا جنھیں اُس نے تبلیغ کے ہتھیار سے فتح کیا ہے بدستور موجود ہیں اور اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام کی زندگی تبلیغ اور صرف تبلیغ پر منحصر ہے۔ پھر کیا یہ تبلیغ مشنری سوسائٹیوں کے ذریعے کی گئی تھی؟ کیا یہ عظیم الشان فتوحات اسی بے عمل چیخ پکار کے ذریعے حاصل ہوئی تھی جس میں آج ہم مشغول ہیں؟ کیا یہ عالمگیریاں ان رسالہ بازیوں، ان کاغذی لڑائیوں اور ان قلمی ترکتازیوں کی مرہونِ منت ہیں جنھیں ہم نے مسیحی مبلغین کی تقلید میں اختیار کیا ہے۔ تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ اس مضمون میں ہم اسی مسئلہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

دُوسرا باب

اِشاعتِ اسلام کے اسباب

اگر واقعات و حقائق کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تین چیزیں لازمی عنصر کی حیثیت سے شریک ہیں :

ایک اُس کے سادہ عقائد اور دلکش عبادات،

دُوسرے مُسلمانوں کی زندگی میں اُس کی تعلیم کے حیرت انگیز نتائج ـــــ اور

تیسرے مُسلمانوں کا ذوقِ تبلیغ۔

پہلی چیز عقل سے اپیل کرتی ہے، دُوسری جذبات کو اُبھارتی ہے اور تیسری ایک مُشفق رہنما کی طرح بُھولے بھٹکوں کو راہِ راست پر لگاتی ہے۔ جس طرح بازار میں ایک متاع کی مقبولیت کے لیے صرف اُس کی ذاتی خُوبی ہی ضمانت نہیں ہوتی بلکہ اُس کے لیے ایسے کارکنوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اُس کی خُوبیاں اور فوائد لوگوں کے ذہن نشین کرائیں اور ایسے شاہد بھی درکار ہوتے ہیں جو اپنے اندر اُس

کے منافع کی عملی شہادت دیں، اسی طرح دنیا میں اسلام کی اشاعت کے لیے بھی ان تینوں چیزوں کے مساویانہ اشتراکِ عمل کی ضرورت رہی ہے اور جب کبھی اس میں کسی ایک کی کمی رہ گئی ہے تو ضرور اشاعتِ اسلام کی تیز رفتاری پر بھی اس کا اثر پڑا ہے ۔ یہ تینوں چیزیں کس طرح اپنا عمل کرتی ہیں اور ان کے اشتراکِ عمل سے کیا نتائج رُونما ہوئے ہیں اس کو جاننے کے لیے ذرا تشریح کی ضرورت ہے ۔

اسلامی عقائد کی سادگی اور فطرت سے ہم آہنگی

اسلامی عقائد اس قدر سادہ اور دل نشین ہیں کہ ایک معمولی سے معمولی عقل کا انسان بھی انھیں تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے ۔ نہ اُن کے اندر کسی قسم کی پیچ در پیچ فلسفیت ہے ۔ نہ اُن میں کسی قسم کے ظن و اوہام سے کام لیا گیا ہے ۔ نہ اُن کے اندر دُور از کار باتوں کو دخل ہے ۔ چند نہایت صاف اور سیدھے سے اصول ہیں جنھیں عقل نہایت آسانی سے قبول کر لیتی ہے اور جنھیں قبول کر لینے کے بعد انسان کو اپنے اندر خود ایک حیرت انگیز انقلاب محسوس ہونے لگتا ہے ۔ ان سب باتوں کے ساتھ اِن کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر چیز نہایت صاف اور قطعی ہے جس کے اندر کسی قسم کے احتمالات نہیں ہیں ۔ خدا کے متعلق اُس نے بالکل واضح عقیدہ پیش کیا ہے :

اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج (الانبیاء : ۱۰۸)

یعنی تمھارا خدا وہی ایک خدا ہے ۔ اس میں دُوئی کا ہرگز احتمال نہیں ہے :

لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ ج (النحل : ۵۱)

اور اُس کے لیے کسی مددگار کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔
(اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝) ـــــ
(وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَاءُ ـــــ ابراہیم ـــــ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ـــــ المائدہ)۔ اُس کی
ذات والدین اور ولدیت سے بھی مبّرا ہے اور کوئی اُس کا ہمسر نہیں ۔
(لَمْ یَلِدْ ۵ وَلَمْ یُوْلَدْ ۵ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ ـــــ الاخلاص)
اُسے کسی قسم کے انسانی عوارض لاحق نہیں ہوتے ۔
(اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۵ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ط ـــــ البقرہ)
آسمان اور زمین میں اُس کے سوا کوئی قوّت ایسی نہیں ہے جس سے انسان اِستمداد
اور استعانت کرسکتا ہو ۔
(اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ۝ ـــــ البقرۃ : ۱۰۷)
وہی اس قابل ہے کہ اُس کی عبادت کی جائے ۔
(فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ۝ ـــــ الزّمر : ۲)
اسی طرح رسالت کے متعلق بھی اُس نے کسی قسم کی اُلوہیّت کا شبہ باقی نہیں
رکھا ہے اور نہایت صفائی کے ساتھ یہ عقیدہ پیش کیا ہے کہ رسول ایک انسان کے
سوا کچھ نہیں ہوتا جسے خُدا نے اپنے بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب
فرما لیا ہے ۔
(اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ ـــــ الکہف : ۱۱۰)
اور ہر قوم کے لیے خُدا نے ایک ہادی بھیجا ہے (وَلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ ۝ الرعد)

اعمال اور اُنکی ذمّہ داری کے متعلق اُس نے پوری صفائی کے ساتھ مُتنبّہ کیا ہے کہ یہاں کوئی کفّارہ اور بدل نہیں ہے ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمّہ دار ہے اور جو شخص جیسے اعمال کرے گا اُسے ویسی ہی جزا یا سزا ملے گی ــــ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ ۝ (الزلزال)

مَعَاد کے متعلق اُس نے ایسا صاف اور واضح عقیدہ پیش کیا ہے کہ کسی مذہب نے بھی نہیں کیا۔ نہ اُس میں بُدھ مذہب کا بعید از عقل فلسفۂ نجات ہے نہ ویدک دھرم کا پیچ در پیچ فلسفۂ تناسُخ اور نہ دہریّت کا عقیدۂ فنائے کامل۔ بلکہ اس میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ عقیدہ پیش کیا گیا ہے کہ انسان اپنی موجودہ زندگی کے اعمال کا نتیجہ اپنی آئندہ زندگی میں دیکھے گا اور اصلی زندگی وُہی ہو گی۔

یہ عقائد اس قدر سیدھے سادھے ہیں کہ انسانی عقل اُنھیں آسانی کے ساتھ قبول کر لیتی ہے اور اسلامی مُبلّغین کو ہمیشہ اپنی تبلیغ میں اس لیے کامیابی ہوتی ہے کہ وُہ کوئی ایسی پیچیدہ چیز پیش نہیں کرتے جسے تسلیم کرنے سے عقل اباء کرتی ہو۔ ایک مشہور فرانسیسی عالم پروفیسر مانٹیٹ اِن عقائد کے متعلق لکھتا ہے کہ: "ایسا عقیدہ جو اس قدر واضح، فلسفیانہ پیچیدگیوں سے اس قدر مُبرّا اور اس قدر معمولی عقل میں آجانے کے قابل ہو اُس میں یقیناً انسانی نفس کو مُسخّر کر لینے کی معجزنما قوّت ہونی چاہیے اور فی الواقع وُہ ایسی قوّت رکھتا ہے۔"

اِنسانی عقل پر اِن عقائد کا جتنا گہرا اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ نہایت آسانی کے ساتھ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک یورپین سیاح افریقہ

کی گالا قوم کے ایک آزاد شدہ غلام سے مِلا، جسے بچپن میں ساحلِ زنج سے پکڑ کر جدّہ میں فروخت کر دیا گیا تھا۔ سیّاح نے اُس سے پوچھا کہ کیا تمہارے دل میں اُن لوگوں کے لیے کوئی نفرت نہیں ہے جنھوں نے تُم کو بلا کسی حق کے پکڑ کر جانوروں کی طرح فروخت کر دیا؟ اِس کے جواب میں اس حبشی غلام نے کہا کہ:

"ہاں میرے دل میں طبعاً اُن کی طرف سے رنج موجود ہے مگر ایک چیز نے اُس کی تلافی کر دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مَیں اُن کی بدولت کُفر کی جہالت سے نکل گیا ہُوں۔ میں اِسے خُدا کا فضل و کرم سمجھتا ہوں کہ میں اس مُلک میں لایا گیا اور مجھے اِسلام کی نعمت حاصل ہوئی۔ یقین کیجیے کہ ایمان کی حلاوت سے بڑھ کر کوئی حلاوت نہیں ہے اور یہ ایسی حلاوت ہے جسے صرف دِل ہی محسوس کرتا ہے، زبان سے اِس کا بیان ممکن نہیں۔"

اِسلامی عبادات کی دِلکشی اور جاذبیّت

یہی حال اِسلامی عبادات کا ہے، ان میں کچھ ایسی دلکشی اور جاذبیّت بھری ہُوئی ہے کہ مانٹیسکیو کے بقول کوئی دِل اُن سے متاثّر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سعید بن حسن اسکندریہ کے ایک یہودی نے لکھا ہے:

"مَیں محض مُسلمانوں کی عبادت کو دیکھ کر مسلمان ہوا ہوں۔ ایک دفعہ میں جامع مسجد میں نماز کا منظر دیکھنے گیا۔ سب سے پہلے جس چیز نے میرے دل پر اثر کیا وہ خُطبہ تھا۔ اُس کا ایک ایک لفظ میرے دل پر اثر کر رہا تھا اور خصوصاً جب خطیب نے کہا:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ ج ——— (النحل : ۹۰)

تو میرے دل میں ایسے مذہب کی بے حد عزت قائم ہوگئی جس کا خدا اتنی اعلیٰ تعلیم دیتا ہو۔ پھر جب نماز شروع ہوئی اور مسلمان پَرے کے پَرے باندھ کر کھڑے ہوئے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ فرشتے ہیں جن کے سامنے خدا بے نقاب ہو کر آگیا ہے اور میرے دل نے کہا کہ اگر خدا نے دو مرتبہ بنو اسرائیل سے کلام کیا تھا تو اس قوم کے ساتھ وہ روز پانچ مرتبہ کلام کیا کرتا ہے۔"

نماز کی یہ شان کہ اُس کے لیے نہ کسی پروہت کی قید ہے نہ پادری کی۔ نہ کسی مندر کی شرط ہے نہ گرجا کی۔ ہر مسلمان امام بن سکتا ہے۔ ہر جگہ اُس کی مسجد ہے اور ہر شخص بلا امتیازِ درجہ و قومیّت اس میں شریک ہو سکتا ہے۔ نماز اس قدر بلا کی تاثیر اپنے اندر رکھتی ہے کہ متعصّب سے متعصّب دشمنانِ اسلام بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک اَن دیکھے خدا کی عبادت اِس انداز کے ساتھ کہ محض اس کے ذہنی تصوّر سے دلوں پر خشوع و خضوع طاری ہے اور تمام حرکات و سکنات سے انتہائی عظمت و خوف کے آثار نمایاں ہیں پتھر سے پتّھر دل کو بھی موم کر دیتی ہے۔ پادری لیفرائے جس سے علمائے ہند کے معرکۃ الآرا مناظرے شاید ابھی تک لوگوں کی یاد میں محفوظ ہوں، اپنی کتاب "MANKIND AND CHURCH" میں لکھتا ہے کہ :

"کوئی شخص مسلمانوں کی اِس عبادت کو دیکھ کر اُس کے اثر سے مغلوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ مسلمان خواہ کہیں ہو، سڑک پر چل رہا

ہو، ریلوے اسٹیشن پر ہو، دوکان پر بیٹھا ہو یا میدان میں ٹہل رہا ہو، اذان ہوتے ہی سب کام چھوڑ دیتا ہے اور ایک خدا کے آگے جھک جاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جس شخص نے دہلی کی جامع مسجد میں الوداع کے دن پندرہ بیس ہزار مسلمانوں کو نہایت خاموشی اور خشوع و خضوع کے ساتھ دیکھا ہو وہ اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کے دل میں اس قوت کا احساس ضرور پیدا ہوتا ہے جو اس مذہبی نظام میں کام کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی روزانہ پنج وقتہ نماز کی باقاعدگی اور انتہائی شور و غل کے اوقات میں بھی ان کا سکون اور اطمینان سے اپنا فرض ادا کرنا اپنے اندر ایک خاص پیغام رکھتا ہے۔"

اسلامی تعلیمات کے اثرات مسلمانوں کی زندگی پر

عقائد و عبادات کے بعد دوسری چیز جو اپنی عملی تاثیر کے اعتبار سے اسلام کی اشاعت میں سب سے زیادہ کارگر قوت ہے، وہ مسلمانوں کی اسلامی زندگی ہے۔ اسلام اگر صرف اصول ہی پیش کرتا اور اس کی تعلیمات میں وہ انقلاب انگیزیاں نہ ہوتیں جنہوں نے وحشی سے وحشی قوموں کو بھی انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیا تو شاید دنیا اس کی طرف بہت کم مائل ہوتی لیکن اس نے اصول کے ساتھ اعمال بھی پیش کیے ہیں اور فی الحقیقت یہ انہی کی مقناطیسی قوت ہے جو دلوں کو اس طرف کھینچتی ہے۔

خدا کی وحدانیت، اس کی قدرت اور صرف اسی کے سزاوارِ استعانت ہونے

کے متعلق اسلام کی تعلیمات نے مسلمانوں کو اس قدر خود دار، اس قدر صابر و شاکر اور اس قدر متحمل و مستقل مزاج بنا دیا ہے کہ وہ نہ کسی سے دنیا میں ڈرتے ہیں، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور نہ کسی بڑی سے بڑی مصیبت کے مقابلے میں مایوس ہوتے ہیں۔ جزا و سزا اور یوم آخر کے متعلق اسلام کی تعلیم نے اُن کے اندر اتنی شجاعت و بہادری پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی کو فانی سمجھ کر ہر وقت اُسے خدا کے نام پر قربان کر دینے کے لیے تیار رہتے ہیں اور اُن کے خون کی حرارت دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ پرہیزگاری اور اتقاء کے متعلق اسلامی تعلیمات نے اُن کے اندر غیر معمولی زہد و تقویٰ پیدا کر دیا ہے، اور شراب، چوری اور اخلاقی جرائم سے احتراز کرنے میں وہ تمام مذاہب کے پیروؤں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ انسانی مساوات اور اسلامی اخوت کے متعلق اسلام کی تعلیم نے ان کے اندر ایسی جمہوری رُوح پھونک دی ہے کہ نہ ان کے ہاں نسل و رنگ کا امتیاز ہے نہ ذات پات کی قید، نہ امیر غریب کا فرق اور نہ قومیت و وطنیت کا تعصب۔ ہر شخص اسلام قبول کر لینے کے بعد اسلامی برادری کا ایک رُکن بن جاتا ہے۔ خواہ وہ کالا ہو یا گورا، امیر ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام، بہر حال مسلمان اُس کو اپنا بھائی سمجھنے پر مجبور ہیں اور وہ نماز میں بڑے سے بڑے مسلمان کے برابر کھڑے ہونے کا حق رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی زندگی میں دوسری اسلامی تعلیمات کے اثرات بھی نہایت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ علم اور تہذیب و تمدن ہے جو اسلام قبول کرتے ہی وحشی سے وحشی قوموں میں گھر کر لیتا ہے۔

یورپ کے مسیحی مبلّغین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں کہ افریقہ کی وحشی سے وحشی قوموں میں اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ مدنیّت کے آثار بھی پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مساجد کی تعمیر، مدارس کا قیام، اجتماعی زندگی اور اس کے ساتھ تجارت اور خوشحالی کی ترقّی، یہ ایسی چیزیں ہیں جو رفتہ رفتہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ افریقہ کی وحشیانہ زندگی کو تمدن و حضارت سے بدل دیتی ہیں اور انھیں دیکھ کر دوسری وحشی قوموں کو بھی وہی مذہب قبول کر لینے کی خواہش ہوتی ہے جو اُن کے ہم جنسوں کو اتنی جلدی اتنے بلند درجے پر پہنچا دیتا ہے۔ تاریخوں میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں جب بالائی نائیجریا کی سب سے زیادہ طاقتور ریاست جنّی[1] میں بربروں نے اسلام کی اشاعت شروع کی تو وہاں نہایت کثرت سے علماء و فضلاء پیدا ہو گئے اور جب بادشاہ نے اسلام قبول کرنے کے لیے ایک مجلس مقرر کی تو اس میں دو ہزار چار سو علماء شریک ہوئے۔ اسلام کے ان مدنیّت پرور اثرات نے عرب، ہندوستان، مصر اور اسپین (اندلس) میں جو حیرت انگیز نقوش چھوڑے ہیں ان کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں۔ تاریخ و آثار کی اُن پر نہایت روشن شہادت موجود ہے۔

اسلامی مساوات کی اثر انگیزی

اسلامی زندگی میں سب سے زیادہ مؤثر چیز مساوات ہے۔ وہ تمام اُن قوموں کے لیے ایک آسمانی رحمت ہے جنھیں رسم و رواج اور طاقت و اقتدار کی خود غرضی نے انسانیت کی عام سطح سے نیچے رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسلام اُن کے لیے

1. Jenne

پیغامِ نجات کا حکم رکھتا ہے اور زمانہ شاہد ہے کہ اس نے ایسی ہزاروں قوموں کو قعرِ ذلت سے اُٹھا کر آسمانِ عزت و شرافت تک پہنچا دیا ہے۔ اس شانِ مساوات نے اسلام کی اشاعت میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اور تقریباً تمام ان علاقوں میں جہاں ایسی مظلوم قومیں رہتی ہیں اسلام کی مقبولیت کا واحد ذریعہ یہی چیز ہے ۔ سر ولیم ہنٹر (SIR WILLIAM HUNTER) بنگال کی نیچ ذات قوموں میں اشاعتِ اسلام کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

"ان غریب مچھیروں، شکاریوں اور نیچ ذات کسانوں کے لیے اسلام ایک آسمانی رحمت بن کر نازل ہوا۔ وہ نہ صرف حکمران قوم کا مذہب تھا بلکہ اس میں اتنی مساوات بھی تھی کہ وہ اس کی بدولت خود اُن لوگوں سے بھی زیادہ بلند درجہ حاصل کر سکتے تھے جو انھیں ذلیل خیال کرتے تھے (یعنی ہندو) اس بنا پر اسلام ملک کے سب سے زیادہ خوشحال صوبہ پر قابض ہو گیا۔ اگرچہ تاریخ میں کہیں کہیں جبریہ اشاعتِ اسلام کی مثالیں بھی ملتی ہیں مگر دراصل قوت وہ چیز نہیں ہے جس کا اسلام ممنون ہے، بلکہ وہ خود اس کی خوبیاں ہیں۔ اس نے اہلِ بنگال کی عقل کو اپیل کیا، اُن کے سامنے انسانیت کا ایک بلند مفہوم پیش کیا، انسانی برادری کا ایک ایسا عجیب اصول قائم کیا جس سے وہ بالکل نا آشنا تھے اور ذات پات کی قیدوں کو بالکل توڑ دیا۔"

جنوبی ہند میں زیادہ تر اسی مساوات کی بدولت اسلام نے ہندویت پر فتح پائی ہے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے ٹناویلی کے علاقہ میں جو واقعہ پیش آیا تھا وہ اس فتح کا ایک سبق آموز نمونہ ہے۔ اس علاقے میں

شُنار نامی ایک قوم رہتی ہے جس کا شمار نیچ قوموں میں ہوتا تھا۔ اپنی ہُنر مندی اور مُستعدی کی بدولت اُس نے کافی دولت پیدا کی اور تعلیم و معاشرت کے اعتبار سے عام ہندوؤں کے مقابلے میں اُس کا درجہ بہت بلند ہو گیا مگر پھر بھی ہندو اُس کے ساتھ وُہی اہانت آمیز سلوک کرتے رہے جو اچھوتوں کے ساتھ وُہ عام طور پر کرتے ہیں۔ اس سے شُناروں کے جذبات کو سخت صدمہ پہنچتا تھا اور اُن کے دِل ہندو مذہب سے پھرتے جاتے تھے۔ آخر ایک مرتبہ ہندوؤں سے اُن کی سخت جنگ ہوئی اور محض چند شناروں کے ایک مندر میں گھس جانے پر ہندوؤں نے ان کو سخت زد و کوب کیا۔ اس پر تمام شناروں نے مُسلمان ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تقریباً چھ سو شُنار اُسی تاریخ کو مسلمان ہو گئے اور جوُں جوُں آس پاس کے دیہات میں اِس واقعہ کی اطلاع پہنچتی گئی شُنار ذات کے لوگ اسلام قبول کرتے چلے گئے۔

افریقہ کے حبشیوں میں بھی یہی انسانی مساوات اور اسلامی اُخوت اشاعتِ اسلام کی سب سے زیادہ مؤثر قوت ہے۔ مسٹر بلائیڈن اپنی کتاب "عیسائیت، اسلام اور نیگرو نسل" (CHRISTIANITY, ISLAM & NEGRO RACE) میں لکھتے ہیں:

"جوُنہی کسی بُت پرست حبشی کے متعلق پیروانِ محمدؐ کو معلوم ہوتا ہے کہ وُہ اسلام لانے کا ارادہ رکھتا ہے تو خواہ وُہ کتنا ہی وحشی اور ادنیٰ درجے کا آدمی کیوں نہ ہو اسے فوراً اپنی اسلامی برادری میں ایک برابر کے رُکن کی حیثیت سے شامل کر لیا جاتا ہے اور محض تالیفِ قلبی ہی کے لیے نہیں بلکہ حقیقتاً بھائی سمجھ کر اُس کی اُتنی

خاطر مدارات کی جاتی ہے کہ وُہ بہت جلدی اپنے لیے اسلام کی غیر معمولی نعمتوں کو محسوس کر لیتا ہے۔ افریقہ میں اسلام کو عیسائیت پر جو تفوق حاصل ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔"

تیسرا باب

صوفی مبلغینِ اسلام کی خدماتِ جلیلہ

گذشتہ صفحات میں اشاعتِ اسلام کے دو اہم اسباب سے بحث کی جا چکی ہے۔ اب اس کے عملی پہلو پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ اس آسمانی صداقت پر ایمان لانے والوں نے اس کی روشنیوں کو اقطاعِ عالم میں پھیلانے کے لیے کیا کیا کوششیں کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصل چیز تو وہی اسلام کی ذاتی خوبیاں اور عملی محاسن ہیں جو ہر قلبِ سلیم سے اس کو ایک سچا دین قبول کرا لیتی ہیں لیکن دنیا کے مشاہدہ میں ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ اچھی سے اچھی متاع بھی اگر اس کا اشتہار نہ ہو تو رکھی رہ جاتی ہے اور بیچنے والے مستعد کارکن (AGENTS) بری سے بری متاع کے خریدار بھی بازار میں پیدا کر لیتے ہیں۔ جب تک کسی چیز کے اوصاف اور منافع کو لوگوں تک پہنچایا نہ جائے اور دلوں میں اس کے لیے شوق پیدا نہ کیا جائے اس وقت تک خاص خاص طبائع کے سوا عام طبیعتیں اس کی طرف

کم رجوع کرتی ہیں؛ اور اسی لیے ہر متاع کی کامیابی عموماً اُس کے سوداگروں کی سرگرمی، مستعدی اور قوّتِ تشہیر پر منحصر ہُوا کرتی ہے۔ یہی اصول مذاہب کی اشاعت پر بھی یکساں حاوی ہے۔ اسلام خواہ کتنا ہی سچا اور بہتر مذہب ہو مگر اس کی اشاعت کے لیے صرف اُس کی ذاتی خوبیاں ہی کافی نہیں ہوسکتیں بلکہ اس کے پیروؤں کا ذوقِ تبلیغ بھی ضروری ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح طور پر یہ ذوقِ تبلیغ اشاعتِ اسلام کے ارکانِ ثلاثہ میں عملی رُکن کی حیثیت رکھتا ہے۔

مسلمانوں کے ذوقِ تبلیغ کی جہانگیری

آج ہم بے عمل مسلمان اُس حیرت انگیز ذوقِ تبلیغ کا ٹھیک ٹھیک تصوّر بھی نہیں کرسکتے جو گزشتہ زمانے کے دیندار مسلمانوں میں کام کر رہا تھا اور جو ہمارے موجودہ زمانہ میں بھی افریقہ، چین[1] اور جزائر ملایا کے مسلمانوں میں کام کر رہا ہے۔ اُن لوگوں کے وظائفِ حیات میں سب سے زیادہ اہم وظیفہ اگر کوئی تھا تو وہ صرف اُس دین کی صداقت کو بنی نوعِ انسان کے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچانا تھا جس کی روشنی سے اُن کے دل معمور تھے۔ اُن کے دِلوں پر یہ عقیدہ پتھّر کی لکیر بنا ہُوا تھا کہ مسلمان کی حیثیت سے اُن کی پیدائش کا مقصد صرف دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ وہ جہاں جاتے تھے یہ مقصد اُن کے ساتھ جاتا تھا اور اُن کی زندگی کے ہر عمل میں اُس کی شرکت لازمی تھی۔ وہ قریش کے مظالم سے بھاگ کر حبشہ گئے تو وہاں بھی اُنھوں نے صرف یہی کام کیا۔ اُنھیں مکّہ سے نکل کر مدینہ میں امن کی زندگی نصیب ہُوئی تو اپنی تمام قوّت اُنھوں نے اسی تبلیغِ دینِ الٰہی میں صرف

[1] یہ اُس زمانے کی بات ہے جب چین پر کمیونسٹوں کا قبضہ نہ ہُوا تھا۔

کردی۔ اُن کو ساسانی اور رومانی تہذیبوں کے بوسیدہ قصر گرا دینے کی خدمت عطا کی گئی تو شام و عراق اور ایران و روم میں بھی اُنھوں نے صرف یہی مقدّس فرض انجام دیا۔

اُنھیں خدا نے زمین کی خلافت عطا فرمائی تو اس سے بھی اُنھوں نے عیش پرستی نہیں کی بلکہ وہ اللہ کے دین کی اشاعت کرتے چلے گئے یہاں تک کہ ایک طرف اوقیانوس کی طوفانی موجوں نے اُنھیں روک دیا اور دُوسری طرف چین کی سنگین دیوار اُن کے راستے میں حائل ہو گئی۔ وہ اپنے تجارتی مال لے کر نکلے تو اس میں بھی ان کے دلوں پر یہی خواہش چھائی رہی اور اُنھوں نے افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں، ہندوستان کی سرسبز وادیوں میں، بحرالکاہل کے دُور اُفتادہ جزیروں میں اور یورپ کے سپید رنگ کفر زاروں میں ملّتِ حنیفی کی روشنیوں کو پھیلا دیا۔

یہ ذوقِ تبلیغ یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ قید خانوں کی کڑی سے کڑی مصیبتیں جھیلتے وقت بھی اُن کے دِلوں سے اس کی لذّت محو نہیں ہوتی تھی۔ وہ اندھیری کوٹھڑیوں میں اپنے اَصحابِ سجن کو بھی اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور حد یہ ہے کہ دار پر بھی اُنھیں اگر کسی چیز کی تمنّا ستاتی تھی تو وہ صرف یہی تھی کہ اپنے آخری لمحاتِ زندگی کو اللہ کا پیغام اُس کے بندوں تک پہنچانے میں صرف کر دیں۔

بیلجئین کانگو کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ جب حکومتِ بلجئیم نے وہاں کے ایک مُسلمان امیر کو گرفتار کر کے سزائے موت کا حکم سُنا دیا تو اُس نے دُنیا سے چلتے چلتے خود اُس پادری کو بھی مُسلمان کر لیا جو اُسے مسیحیت کا پیغامِ نجات دینے گیا تھا۔

حضرت سیّد مجدّد احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کُتبِ سِیَر میں لکھا ہے کہ

جہانگیر کی قید میں دو سال کا زمانہ اُنھوں نے محض فریضۂ تبلیغ کی انجام دہی میں گزارا اور جب رہا ہوئے تو کئی سو ہندو قیدی اُن کی برکت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ ہمارے موجودہ زمانے میں بھی مولانا محمد جعفر تھانیسری نے، جو مجاہدین سرحد سے ساز باز رکھنے کے الزام میں کالے پانی بھیجے گئے تھے، انڈمان کے بہت سے قیدیوں کو مسلمان کر لیا تھا۔ مشرقی یورپ میں تو اسلام کی اشاعت تنہا ایک مسلمان عالم کی کوششوں کا نتیجہ تھی جو نصاریٰ سے جہاد کرتا ہوا گرفتار ہو گیا تھا۔ قید کی حالت میں وہ پابہ زنجیر ڈان اور ڈینیوب کے درمیانی علاقے میں بھیج دیا گیا اور وہاں اُس کے خلوصِ قلب کی روشنی اِس قدر پھیلی کہ تھوڑے عرصے میں بارہ ہزار آدمی مسلمان ہو گئے اور چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تقریباً سارا علاقہ اِسلام کی برکات سے معمور ہو گیا۔

مُسلمان خواتین کا ذوقِ تبلیغ

اِس عالمگیر ذوق سے مُسلمانوں کی عورتیں بھی خالی نہ تھیں۔ تاتاری مُغلوں سے جن ہاتھوں نے مُسلم کُشی کی تلوار چھین کر اِسلام کی اِطاعت کا طوق پہنایا تھا وہ اُنھی ضعیف اور نازک عورتوں کے ہاتھ تھے جنھیں یہ لوگ ممالکِ اسلامیہ سے لونڈیاں بنا کر لے گئے تھے۔ غازان شاہ کے بھائی اولجایتو خاں کو اُس کی بیوی ہی نے مُسلمان کیا تھا اور اسی کی بدولت ایلخانی حکومت ایک اسلامی حکومت بن گئی تھی۔ چغتائی خاندان مُسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا مگر قُرّہ، ہلاکو خاں کی مسلمان بیوی، نے اُسے سب سے پہلے اسلام سے متعارف کیا اور اُسی کے اثر سے مُبارک شاہ اور براق خاں مُسلمان ہوئے۔ تاتاری فوجوں کے ہزارہا سپاہی اپنے ساتھ مُسلمان عورتوں کو لے گئے تھے۔

اُنھوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ کر اپنے کافر شوہروں کا مذہب اختیار کرنے کے بجائے اُنھیں، اور زیادہ تر اُن کے بچوں کو، مسلمان کر لیا اور اُنہی کی بدولت تمام بلادِ تاتار میں اسلام پھیل گیا۔ اسی طرح ملکِ حبش میں بھی خواتین ہی نے اشاعتِ اسلام کا کام کیا ہے۔ چنانچہ متعدد ایسے حبشی رئیسوں کا تذکرہ تواریخ میں مذکور ہے جنھیں اُن کی مسلمان بیویوں نے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا۔ سنوسی مبلّغین نے تو وسطِ افریقہ میں مستقل طور پر اشاعتِ اسلام کے لیے خواتین کے اداروں سے کام لیا ہے۔ چنانچہ وہاں سینکڑوں زنانہ مدارس قائم ہیں جن میں لڑکیوں کو اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔

صوفیائے کرامؒ کی خدمات ہندوستان میں

مگر مسلمانوں میں جو جماعت سب سے زیادہ تبلیغِ دینِ الٰہی کے ذوق و شوق سے گرمِ سعی رہی ہے وہ وہی صوفیائے کرام کی جماعت ہے جو آج ہندوستان[1] میں اس طرف سے تقریباً بالکل ہی غافل ہے۔ خود ہندوستان میں اولیا و صوفیا نے جس بے نظیر استقلال اور دینی شغف کے ساتھ اسلام کی روشنیوں کو پھیلایا ہے وہ ہمارے آج کل کے حضراتِ متصوفین کے لیے اپنے اندر ایک عمیق درسِ بصیرت رکھتا ہے۔ یہاں کے سب سے بڑے اسلامی مبلّغ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کی برکت سے راجپوتانہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور جن کے بالواسطہ اور بلاواسطہ مریدین تمام اقطاعِ ملک میں اسلام کی شمعِ ہدایت لے کر پھیل گئے۔ حضرت

---

[1] غیر منقسم ہندوستان یعنی موجودہ پاکستان اور بھارت مراد ہے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے **دہلی** کے اطراف میں، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے علاقہ **پنجاب میں**، حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی اور اس کے نواح میں، حضرت سید محمد گیسو درازؒ، حضرت شیخ برہان الدینؒ اور حضرت شیخ زین الدینؒ اور آخر زمانہ میں (اورنگ آباد کے) حضرت نظام الدینؒ نے ملک **دکن میں** اور دورِ آخر میں حضرت شاہ کلیم اللہؒ جہان آبادی نے دہلیٔ مرحوم میں بھی دعوتِ الی الخیر اور تبلیغ او امرِ اسلام کی خدمت انجام دی۔ ان کے علاوہ دوسرے سلسلوں کے اولیائے عظام نے بھی اس کام میں انتھک مستعدی سے کام لیا۔ **پنجاب میں** سب سے پہلے اسلامی مبلّغ حضرت سید اسمٰعیل بخاریؒ تھے جو پانچویں صدی ہجری میں لاہور تشریف لائے تھے۔ اُن کے متعلق مشہور ہے کہ لوگ ہزارہا کی تعداد میں اُن کے ارشادات سننے آتے تھے اور کوئی شخص جو ایک مرتبہ ان کا وعظ سن لیتا وہ اسلام لائے بغیر نہ رہتا۔ **مغربی پنجاب میں** اسلام کی اشاعت کا فخر سب سے زیادہ حضرت بہاء الحق زکریا ملتانیؒ کو حاصل ہے۔ علاقہ **بہاولپور اور مشرقی سندھ میں** حضرت سید جلال بخاریؒ کے فیضانِ تعلیم سے معرفتِ حق کی روشنی پھیلی اور اُن کی اولاد میں سے حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے پنجاب کے بیسیوں قبائل کو مسلمان کیا۔ ایک اور بزرگ حضرت سید صدر الدینؒ اور اُن کے صاحبزادے حضرت حسن کبیر الدینؒ بھی پنجاب کے بہت بڑے اسلامی مبلّغ تھے۔ حضرت حسن کبیر الدینؒ کے متعلق تواریخ میں لکھا ہے کہ اُن کی شخصیت میں عجیب کشش تھی۔ محض اُن کے دیکھ لینے سے دل پر اسلام کی عظمت و صداقت کا نقش مرتسم ہو جاتا تھا اور لوگ خود بخود اُن کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

سندھ میں اشاعتِ اسلام کا اصلی زمانہ وُہ ہے جب حکومت کا دَور ختم ہو چکا تھا۔ آج سے تقریباً چھ سو برس پہلے حضرت سید یوسف الدینؒ وہاں تشریف لائے اور اُن کے فیضِ اثر سے لوہانہ ذات کے سات سو خاندانوں نے اسلام قبول کرلیا۔ کچھ اور گجرات میں حضرت امام شاہ پیرانویؒ اور ملک عبداللطیفؒ کی مساعی سے اِسلام کی اشاعت ہوئی۔ بنگال میں سب سے پہلے شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اِس مقدس فرض کو انجام دیا جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مُریدانِ خاص میں سے تھے۔ آسام میں اس نعمتِ عظمیٰ کو حضرت شیخ جلال الدین فارسیؒ اپنے ساتھ لے گئے جو سلہٹ میں مدفون ہیں۔ کشمیر میں اسلام کا علم سب سے پہلے بُلبل شاہؒ نامی ایک درویش نے بلند کیا اور اُن کے فیضِ صحبت سے خود راجہ مُسلمان ہو گیا جو تاریخوں میں صدر الدین کے نام سے مشہور ہے۔ پھر ساتویں صدی ہجری میں سید علی ہمدانیؒ سات سو سیدوں کے ساتھ یہاں تشریف لائے اور تمام خطۂ کشمیر میں اس مقدس جماعت نے نُورِ عرفان کو پھیلایا۔ حضرت عالمگیرؒ کے عہد میں سید شاہ فرید الدینؒ نے کشتواڑ کے راجہ کو مُسلمان کیا اور اُس کے ذریعہ علاقۂ مذکور میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ دکن میں اسلام کی ابتدا پیر مہابیر کھمدایت سے ہوئی جو آج سے سات سو برس پہلے بیجاپور تشریف لائے تھے۔ ایک اور بزرگ جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے علاقہ کونکن[1] کے ہادی اور رہبر تھے۔ دھارواڑ کے لوگ اپنے اسلام کو حضرت شیخ ہاشم گجراتیؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو ابراہیم عادل شاہ کے پیرِ طریقت تھے۔ ناسک میں حضرت محمدؐ صادق سرمستؒ اور خواجہ اخوند میر حسینیؒ[2] کی برکاتِ رُوحانی

---

[2] Kh. Khunmir Husayni.   [1] Konkan.

کا اب تک اعتراف کیا جاتا ہے ۔ مدراس بھی اپنی ہدایت کے لیے چند صاحب حال بزرگوں کا رہین منّت ہے جن میں سب سے زیادہ مشہور سیّد نثار شاہ مدفون ترچنا پلّی ہیں ۔ دوسرے بزرگ سیّد ابراہیم شہیدؒ ہیں جن کا مزار ارداری میں ہے اور تیسرے بزرگ شاہ الحامدؒ ہیں جن کا مدفن ناگور میں واقع ہے ۔ نیو گنڈرا کی طرف اسلامی آبادی عام طور پر اپنے اسلام کو حضرت بابا فخر الدینؒ کی طرف منسوب کرتی ہے جنھوں نے وہاں کے راجہ کو مسلمان کیا تھا ۔

حضرات صوفیائے کرام کی انہی تبلیغی سرگرمیوں کا اثر آج تک ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی جماعت اگرچہ مسلمان نہ ہو سکی مگر اب تک اسلامی پیشواؤں کی گرویدہ ہے ۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں صوبہ شمال مغربی (موجودہ صوبہ متحدہ) کے ۲۳۲۳۶۴۳ ہندوؤں نے اپنے آپ کو کسی خاص دیوتا کا پرستار بتلانے کے بجائے کسی نہ کسی مسلمان پیر کا پجاری ظاہر کیا تھا ۔ افسوس کہ وہ لوگ ہندوؤں کی ایک کثیر آبادی پر اسلام کا غیر معمولی اثر چھوڑ گئے مگر آج ہم اس اثر سے بھی فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں ۔

ہندوستان سے باہر

ہندوستان سے باہر بعض دوسرے ممالک میں بھی اس مقدّس جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں نے حیرت انگیز نتائج پیدا کیے ہیں ۔ خصوصیّت کے ساتھ قرونِ متوسّط کی تاریخ میں تو یہ واقعہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جب فتنۂ تاتار نے اسلامی حکومت کے قصرِ فلک بوس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو تمام وسطِ ایشیا

میں صرف ایک صُوفیائے اسلام کی رُوحانی قُوّت تھی جو اُس کے مقابلے کے لیے باقی رہ گئی تھی اور بالآخر اسی نے اسلام کے اس سب سے بڑے دُشمن پر فتح حاصل کی۔
لیکن مُسلمانوں کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ یہ زبردست قُوّت بھی جس نے اقطارِ عالم میں اسلام کی روشنی پھیلائی اور تاتار کے زبردست فتنے تک کو اس کے لیے مُسخّر کر دیا جو قریب تھا کہ وسطِ ایشیا سے اس کو بالکل فنا کر دیتا، آج بالکل مُضمحل ہو گئی ہے اور اگر ہمارے مُحترم حضراتِ متصوّفین ہمیں مُعاف کریں تو ہمیں اس امرِ واقعی کے اظہار میں بھی کچھ تامّل نہیں ہے کہ اب وُہ اسلام کی برکات وفیوض سے دُنیا کو معمور کرنے کے بجائے بہت حد تک خُود ہی غیر اسلامی مفاسد سے مغلوب ہو کر رہ گئی ہے۔

افریقہ میں

موجُودہ عہد میں یہ قُوّت صرف افریقہ میں زندہ ہے اور تبلیغِ دینِ الٰہی کے سلسلے میں اس کی عظیم الشّان کامیابیاں ہمارے مُلک کے صُوفیائے کرام کے لیے سرمایۂ عبرت وبصیرت ہیں۔

اِن صُوفی جماعتوں میں ایک "جماعتِ امیر غلنیہ" ہے جس کے بانی محمد عثمان الامیر غنی نے ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۳ء تک مشرقی سوڈان کے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی اور اطراف میں بیسیوں بُت پرست قبائل کو مسلمان کر لیا۔

دُوسری جماعتِ قادریہ ہے۔ مغربی افریقہ میں اس سلسلے کے لوگ نویں صدی ہجری سے موجود ہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں اُن کے اندر بھی ایک نئی زندگی پیدا ہوئی اور اُنھوں نے مغربی سوڈان سے لے کر ٹمبکٹو اور سینیگال تک اپنے حلقے قائم کر لیے۔ خصوصیت کے ساتھ نانگا، ٹیمبو اور مسارڈو میں اُنھوں نے بہت بڑے حلقے قائم کر لیے اور نہایت کثرت سے بُت پرست قبائل میں اسلام کی اشاعت شروع کر دی۔ ان کا اصول یہ ہے کہ جب کسی آبادی میں اسلام کی اشاعت کر چکتے ہیں تو وہاں کے ذہین اور صاحبِ استعداد لڑکوں کو اپنے مرکزی حلقوں میں تعلیم کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ یا اگر اُن میں زیادہ صلاحیت دیکھتے ہیں تو علومِ دینی کی تکمیل کے لیے قیروان، فاس، طرابلس یا الازہر (مصر) بھیج دیتے ہیں اور پھر واپسی پر اُنھی کو اپنی بستیوں میں تبلیغ و تعلیم کے لیے مقرر کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے نہایت کثرت سے اندرونِ افریقہ میں مدارس قائم کر رکھے ہیں اور اُن میں صحیح اصولوں پر وحشی قبائل کے لڑکوں کی تربیت کرتے ہیں۔

ایک اور سلسلہ "تیجانیہ" کے نام سے مشہور ہے جو سب سے پہلے الجزائر میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے اصولِ تبلیغ تقریباً وُہی ہیں جو سلسلۂ قادریہ کے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ وُہ تبلیغ کے ساتھ جہاد بھی کرتا ہے اور اس لیے عیسائی مشنریوں کو اس کے خلاف یورپی استعمار سے مدد حاصل کرنے کا اچھا خاصا بہانہ ہاتھ آجاتا ہے۔ اس کا حلقۂ اثر شمالی افریقہ کا مغربی حصّہ ہے اور اس کا سب سے زیادہ سرگرم داعی الحاج عُمر تھا جو اپنے زُہد و تقویٰ کے لیے افریقہ سے حجاز تک شہرت رکھتا تھا۔ اُس

نے ۱۸۳۳ء میں تبلیغ کا کام شروع کیا اور بالائی نائیجریا اور سینگال تک کے بُت پرست قبائل کو مسلمان کر کے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی، جسے آخر میں فرانسیسی استعمار نے پیوندِ خاک کر دیا۔

اِن تمام جماعتوں میں سب سے زیادہ زبردست سنّوسی جماعت ہے۔ ۱۸۳۳ء میں الجزائر کے ایک مشہور عالم سیدی محمدؐ بن علی السنّوسی نے طریقۂ سنوسیہ کی ابتدا کی، جس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح، فرنگی استعمار کی مدافعت اور اسلام کی اشاعت تھا۔ بائیس سال کے عرصے میں اُنھوں نے ایک ایسی زبردست جماعت تیار کر لی جس کا نظام سلطنتوں کے نظام سے زیادہ مکمّل تھا، جس کا ہر شخص جماعتی مقاصد کی لگن میں ڈوبا ہُوا تھا اور جس کے ہر رُکن کو خالص اسلامی تربیت دے کر سچّا مسلمان بنا دیا گیا تھا۔ اس میں قرآن مجید کے لفظ لفظ پر عمل کرنا پہلی شرط ہے۔ اولیا کی پرستش، مزارات کی زیارت، کافی اور تمباکو کا استعمال، یہودیوں اور عیسائیوں سے تعلقات سب ممنوع ہیں اور ہر شخص ایک سچّے مجاہد کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ مصر سے لے کر مراکش تک اور ساحلِ طرابلس سے لے کر صحرائے افریقہ کے آخری کونوں تک اِس کی خانقاہیں قائم ہیں اور افریقہ کے علاوہ عرب، عراق اور جزائرِ ملایا تک اس کا اثر پھیلا ہُوا ہے۔ اس کی تبلیغی کوششوں نے افریقہ کے ان تمام قبائل کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا دیا ہے جو صرف برائے نام مسلمان رہ گئے تھے اور گالا، ٹبیسٹی اور بورکو کے علاقوں تک اسلام کی ایک نئی رُوح پھونک دی ہے۔ قادریہ سلسلہ کے لوگوں کی طرح، اُن کے ہاں بھی صرف وعظ و تلقین نہیں ہے بلکہ یہ مسلمان بنانے کے بعد

نومسلموں کو عملی تربیت بھی دیتے ہیں تاکہ وہ خود اپنے ہم جنسوں کو اسلام کی دعوت دے سکیں۔

ان افریقی جماعتوں نے وحشی قبائل میں جو عجیب زندگی پیدا کر دی ہے اُس کے متعلق ایک یورپی سیّاح لکھتا ہے:

"دریائے نائیجیریا کے کنارے کنارے جب میں وسط افریقہ کی طرف روانہ ہوا تو پہلے دو سو میل تک مجھے اپنے خیالات کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہوئی جو میں افریقی وحشت و بربریّت اور مردم خوری کے متعلق رکھتا تھا مگر جب میں وسط سوڈان کے قریب پہنچ گیا تو مجھے قبائل کی زندگی میں ایسے ترقّی پذیر آثار نظر آنے لگے جنھیں دیکھ کر میری رائے بدلنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں مردُم خوری کا کوئی وجُود نہیں ہے۔ بُت پرستی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ شراب خوری وغیرہ کی عادات زائل ہو چکی ہیں۔ تمام قبائل کپڑے پہنتے ہیں اور لباس میں نفاست، پاکیزگی اور معاشرت میں تہذیب موجود ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اخلاقی درجہ اپنے ہم جنس قبائل سے بہت بالاتر ہے۔ ہر چیز ترقّی کرتی نظر آرہی ہے۔ حبشی فطرت کسی بلند تر فطرت سے بدل رہی ہے اور یہ سب کچھ اسلام کے طفیل ہے۔" "لوکوجا" سے گزرنے کے بعد میں اسلامی تبلیغ کے اصلی مرکز میں پہنچا اور وہاں میں نے ایک اعلیٰ درجہ کی منظّم حکومت کو کارفرما پایا۔ ہر طرف آبادی میں تمدّن کے آثار موجود تھے۔ تجارت اور صنعت و حرفت کی گرم بازاری تھی اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک مہذّب ملک میں ہوں۔"

چوتھا باب

اِشاعتِ اِسلام افریقہ میں

ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ مُسلمانوں میں کبھی باقاعدہ مشنری سوسائٹیوں کا وجُود نہیں رہا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کے مذہب نے خدمتِ دین کو کسی خاص طبقے تک محدُود نہیں رکھا بلکہ ہر مسلمان پر یکساں فرض کیا ہے کہ وُہ بشرطِ امکان اپنی تمام قوتیں دین کی خدمت میں صرف کر دیں۔ جس طرح عیسائیوں میں ایک خاص جماعت کے سوا نہ کوئی جماعت مذہبی اُمور میں حِصّہ لیتی ہے اور نہ مذہبی شغف رکھتی ہے اسی طرح اگر مسلمانوں میں بھی کوئی مذہبی طبقہ قائم کر دیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ اُن میں بھی اپنے مذہب کی اِشاعت کا ذوق صرف ایک مُختصر سی جماعت تک محدُود رہتا اور عام مسلمان اس سے بے بہرہ رہتے۔

لیکن اِس جمہوری مذہب کے لیئے جو فضیلت کا معیار صرف اعمالِ حسنات کو قرار دیتا ہے، یہ بہت مُشکل تھا کہ وُہ برکت و سعادت میں بھی تعمیم

(عمومیت) نہ رہتا۔ چنانچہ دُنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے پیروؤں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا ذوق سب سے زیادہ پایا جاتا ہے اور جس کا ہر فرد ایک مُبلّغ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم گذشتہ صفحات میں اس ذوقِ تبلیغ کی جہانگیری و عمومیّت پر بحث کر چکے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی جائے کہ اس ذوقِ عمیم نے کس طرح ملکوں کو فتح کیا ہے اور وہ کون لوگ تھے جن کے ہاتھوں اسلام کو اس قدر عالمگیر وسعت حاصل ہوئی ہے۔ ہندوستان[1]، ایران اور عرب و مصر وغیرہ ممالک کو جانے دیجیے کہ یہاں مسلمانوں کو حکومت بھی حاصل ہوئی ہے اور اس لیے مخالفین یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ ان ممالک میں اشاعت اسلام تلوار کی رہینِ منّت ہو۔ ہمیں افریقہ، چین اور جزائر ملایا کو لینا چاہیے جہاں تمام مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کو کبھی تلوار استعمال کرنے کا موقعہ نہیں ملا اور اس سے زیادہ ممالکِ تاتار و ترکستان کو لینا چاہیے، جہاں تاریخ کا صریح فتویٰ یہ ہے کہ غیر مسلح اسلام نے مسلح کفر کا مقابلہ کر کے اسے شکست دی ہے۔ ان مثالوں سے ہم قارئینِ کرام کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مذہبی شغف رکھنے والے مسلمانوں نے اس دینِ مقدس کی کس طرح خدمت کی ہے اور اگر ہم بھی اسی طرح مذہبی جذبے سے متحرک ہو جائیں تو کس طرح تبلیغ و حفاظتِ اسلام کے ان مسائل کو حل کر سکتے ہیں جن کے لیے کانفرنسوں پر کانفرنسیں منعقد کی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے افریقہ سے بحث کریں گے۔

---

[1] برّصغیر پاک و ہند

افریقہ میں آفتابِ اسلام کا طلوع

مغربی سوڈان میں اسلام کی اشاعت سب سے پہلے اُن نو مسلم بربروں نے کی جو تجارت کے سلسلے میں وہاں آتے جاتے تھے۔ ان بربری قبائل میں لمطونہ اور جدالہ نامی دو قبیلوں نے یوسفؒ بن تاشفین کے عہد میں تقریباً تمام مغربی سوڈان کو اسلام کی روشنیوں سے منّور کر دیا تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں انہی بربری تاجروں نے گھانا (Ghana) کی حبشی ریاست کو مسلمان کر لیا اور اُس کے بعد سوڈان کی قدیم ترین ریاست سونغائی[1] بھی اُن کے ہاتھوں مسلمان ہو گئی۔ چھٹی صدی ہجری میں ان کے اثرات دُور دُور تک پہنچ گئے اور اس کے بعد ٹمبکٹو کا مشہور تجارتی شہر اشاعت اسلام کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ حبشی لوگ تجارت کے سلسلے میں یہاں آتے تھے اور بربری تاجروں سے اسلام کی متاعِ گراں بہا لے کر تمام سوڈان اور نائجیریا میں پھیل جاتے تھے۔ ان لوگوں میں مذہبی شغف اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ ابنِ بطوطہ جب وہاں پہنچا تو اس کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"یہ لوگ قرآن کے عاشق ہیں اور نماز کی پابندی کا یہ عالم ہے کہ جمعہ کے دن اگر سویرے سے جا کر مسجد میں نہ بیٹھ جاؤ تو جگہ ملنی محال ہو جاتی ہے۔"

اِن نو مسلم قوموں میں اِسلام کی سب سے زیادہ سرگرم مبلّغ ماندنگو قوم تھی جو تمام افریقہ میں اپنی عادات و خصائل کے اعتبار سے نہایت ممتاز قوم ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہاؤسا قوم نے اسی کی کوششوں سے اسلام قبول کیا اور ہاؤسا قوم وہ ہے جو وسطی بالائی افریقہ میں نہایت ذہین، مستعد اور تجارتی قوم شمار ہوتی ہے۔ تقریباً

1. Songhay.

تمام سوڈان اور نائیجیریا کی تجارت پر قابض ہے اور گیانا سے لے کر قاہرہ تک اس کے تجارتی کاروان آتے جاتے ہیں۔ اشاعتِ اسلام کے لیے اِس تجارتی قوم کی زبردست کوششوں کا ذِکر آگے آتا ہے۔

مشرقی سوڈان میں اسلام کی اشاعت مِصری تاجروں نے کی اور خصوصیت کے ساتھ جب مِصر کی فاطمی خلافت کا خاتمہ ہُوا تو بہت سے عرب بھاگ کر سوڈان کے علاقے میں پہنچ گئے اور اُنھوں نے اس علاقے میں دُور دُور اِسلام کو پھیلا دیا۔ اِس علاقے میں تُونس اور طنجہ کے عرب تاجروں نے بھی اس فریضۂ مقدسہ کو انجام دیا ہے اور خصوصاً جنوب مغربی سوڈان اس سعادتِ عُظمیٰ کے لیے اُنہی کا منّت کشِ احسان ہے۔ بعد میں احمد نامی ایک عرب نے "دارفُور" میں اِسلامی حکومت بھی قائم کر دی جسے کئی سو برس بعد محمّد علی پاشا نے اپنی حکومت میں جذب کر لیا۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں...

اٹھارویں صدی کے اواخر میں بالائی افریقہ کے مسلمانوں میں ایک نئی تبلیغی رُوح پیدا ہوئی جس کی ابتدا شیخ عثمان دانفودیو سے ہوتی ہے۔ اس شخص نے عبدالوہاب نجدی کی تعلیمات سے متاثر ہو کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مُردہ سُنّت میں دوبارہ جان ڈال دی۔ خصوصیت کے ساتھ فُلبی[1] قوم میں اس نے کچھ ایسا اِسلامی جوش بھر دیا کہ وہ اسلام کی خدمت کے لیے سر بکف کھڑی ہو گئی اور "گوبر"[2] کی قدیم ریاست میں بُت پرستی کا خاتمہ کر کے تمام ہاؤسا لینڈ کو کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک کر دیا۔ ۱۸۱۶ء میں جب عثمان دانفودیو کا انتقال ہُوا تو وہ ممالکِ ہاؤسا

1. Fulbe. 2. Gober.

کا کامل خود مختار بادشاہ تھا اور اس کی وسیع قلمرو میں کہیں بُت پرستی کا نام ونشان تک باقی نہ تھا۔ ۱۹۰۰ء میں انگریزوں نے اِس اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا مگر ہاؤسا اور فلبی قوموں کے ذوقِ تبلیغ پر اس محکومی کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ اسی بیسویں صدی میں انھوں نے یوروبا کے بُت پرست علاقہ کو اسلام سے روشناس کرایا ہے اور دریائے نائجر کے جنوب تک دینِ مُبین کی اشاعت کی ہے۔ اُجیلیبُو کے علاقہ میں پہلی مرتبہ انھوں نے ۱۸۹۴ء میں اپنا کام شروع کیا اور چند ہی سال میں اس قدر ترقی کی کہ ۱۹۰۸ء میں وہاں کے ایک شہر میں بیس اور دُوسرے میں بارہ مسجدیں بن گئیں۔ اِسی طرح دریائے نائجر کے جنوب میں وہ ۱۸۹۸ء کے بعد اسلام کا پیغام لے کر گئے اور ۱۹۱۰ء میں یہ کیفیت ہوگئی کہ اِس علاقے میں مُشکل ہی سے کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہوگا جس نے اِس صدائے حق پر لبیک نہ کہی ہو۔

افریقہ کا مغربی ساحِل مُسلمانوں کا ایک اور تبلیغی میدان ہے۔ گیانا، سیرالیون، لائبیریا اور منڈی[1] وغیرہ ساحلی علاقوں میں آج سے کوئی سوا سو برس پہلے مُسلمان تاجروں اور دیگر کاروباری آدمیوں نے تبلیغِ اسلام کی ابتدا کی اور تھوڑی ہی مُدّت میں وہاں کی وحشت کو تہذیب وتمدّن سے بدل دیا اور ۱۸۰۲ء میں سیرالیون کی ایک انگریزی کمپنی نے دارالعوام میں ایک درخواست پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"یہاں سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر آج سے ستّر برس پہلے چند مُسلمان تاجر آکر مقیم ہوئے تھے۔ عام مُسلمانوں کی طرح یہاں بھی انھوں نے مدرسے قائم کرکے

---

[1] Mendi: سیرالیون سے تقریباً ایک سو میل جنوب میں ایک علاقہ

اسلامی تعلیم دینی شروع کر دی اور اس بات کا عہد کر لیا کہ جو شخص اسلام قبول کرے گا اُسے غلام بنا کر نہیں بیچا جائے گا۔ تھوڑے عرصے میں یہاں تہذیب اور تمدن کے اثرات رُونما ہونے لگے۔ آبادی بڑھ گئی۔ خوشحالی نے ترقی کی اور رفتہ رفتہ اِس علاقے میں اسلام کا اثر سب پر غالب آ گیا۔ لوگ فوج در فوج مسلمانوں کے مذہب میں داخل ہو رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب سارا علاقہ مُسلمان ہو جائے گا۔"

سیرالیون ہی کے لوگوں میں جو تبلیغِ اسلام ہوئی اُس کے متعلق ڈاکٹر ویبر کہتا ہے کہ :

"اِن لوگوں کے ہاں کوئی خاص جماعت تبلیغِ دین کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان کا ہر فرد مُبلّغ ہے۔ جہاں کہیں پانچ چھ مُسلمان جمع ہو جاتے ہیں وہیں ایک مسجد بن جاتی ہے اور وُہ چھوٹی سی عمارت ہی اس بستی میں اشاعتِ اسلام کا مرکز ہوتی ہے۔ ان کے اصول بھی نہایت سادہ ہیں۔ ہر شخص جو کلمہ پڑھ کر نماز پڑھنے اور شراب سے پرہیز کرنے کا اقرار کر لیتا ہے وُہ اِن کی عالمگیر برادری کا ایک رُکن بن جاتا ہے۔"

گیانا میں اسلام کے سرگرم مُبلّغ ہاؤسا قوم کے تاجر ہیں۔ ان کی دلکش معاشرت اور امتیازی نشان وحشی قبائل کو ان کے گرد کھینچ لاتی ہے اور وُہ نہایت کامیابی کے ساتھ اُنھیں اپنے مذہب میں داخل کر لیتے ہیں۔ داہومی اور اشانتی میں اِن قوموں نے ابھی چند ہی سال سے کام شروع کیا ہے اور اس لیے تمام مغربی افریقہ میں بھی دد

علاقے ایسے ہیں جہاں ابھی تک تھوڑا بہت کفر و بت پرستی کا نام و نشان باقی ہے۔ لاگوس میں مسلمانوں کا بڑا زور ہے۔ اُن کی آبادی تقریباً پندرہ ہزار تک پہنچ چکی ہے، جن میں فلبی، ہاؤسا اور مانڈنگو تینوں قوموں کے لوگ موجود ہیں۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں ان لوگوں کو دُور دُور تک جانا پڑتا ہے اور اس لیے ان کی بدولت تمام سواحلِ نائجیریا اور گولڈ کوسٹ نورِ اسلام سے منوّر ہو رہا ہے۔ سینگال کے دہانہ سے لاگوس تک دو ہزار میل کے ساحل پر تقریباً ایک بستی بھی ایسی نہیں جہاں کم از کم ایک مسجد اور ایک مولوی موجود نہ ہو۔ ہر مسلمان خواہ وُہ تاجر ہو یا انگلستان و فرانس و بلجیم کا ملازم، اُس کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ جس کافر و بت پرست سے ملتا ہے اُس تک قرآن کی تعلیم پہنچا دیتا ہے۔ اس زبردست ذوقِ تبلیغ نے عیسائی مشنریوں کی تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔

مشرقی افریقہ بھی عربی تاجروں ہی کے ذریعہ اسلام کی سعادتِ عظمیٰ سے بہرہ اندوز ہُوا۔ بیسویں صدی عیسوی تک ان لوگوں نے تمام سواحلِ زنج کو اسلام سے روشناس کر دیا تھا اور جگہ جگہ اسلامی بستیاں قائم ہو گئی تھیں مگر اصل تبلیغی کام اُس وقت شروع ہُوا جب جرمنی، انگلستان اور اٹلی وغیرہ نے ان ممالک میں نوآبادیاں قائم کیں اور اندرونِ ملک تک پہنچنے کے ذرائع مکمل کر لیے۔ اس وقت نظامِ حکومت قائم کرنے کے لیے ان سلطنتوں کو مسلمانوں کے سوا اور کوئی جماعت نہیں مل سکتی تھی۔ چنانچہ فوج، پولیس، عدالت، تعلیمات، مالگذاری، غرض ہر محکمہ میں مسلمان بھرتی کیے گئے اور انھوں نے اندرونِ افریقہ میں پہنچ کر سب سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ

جو خدمت انجام دی وُہ اسلام کی اشاعت تھی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں اُنھوں نے بونڈی[1] اور وادیگو قبائل کو تقریباً بالکل مسلمان کر لیا۔ ۱۹۰۵ء کے بعد وُہ مغرب میں ٹانگانیکا تک اور شمال میں اوسمبارا تک اور جنوب میں نیاسا تک قرآنی تعلیمات لے کر پھیل گئے۔ ۱۸۹۱ء میں اوسمبارا میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا بلکہ اُن سے نفرت کی جاتی تھی، مگر جب باقاعدہ حکومت قائم ہوئی اور مسلمان افسر وہاں پہنچے تو تھوڑے ہی عرصے میں تقریباً تمام وُہ لوگ مسلمان ہو گئے جو سرکاری افسروں سے کوئی واسطہ رکھتے تھے اور اکثر ان مدارس میں اسلام پھیل گیا جہاں مسلمان مدرس مامور تھے۔ اسی طرح نیاسا لینڈ میں بھی دس سال کے اندر اندر اسلام نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور مسیحی مبلغین معترف ہیں کہ اِن ممالک میں مسلمان بن جانا انسان بن جانے کا ہم معنی ہے۔

کیپ کالونی میں اسلام کی اشاعت جزائر ملایا کے تاجروں نے کی ہے۔ یہ لوگ حکومتِ ہالینڈ کے زیرِ اثر ہونے کے باعث عرصے سے یہاں مقیم ہیں اور نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے دین کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ۱۸۰۹ء میں کو لبرُوک نے لکھا تھا کہ:

"ہمارے مبلغین کی انتہائی کوششوں کے باوجود مسلمان مبلغ نہایت کثرت کے ساتھ سیاہ رنگ غلاموں اور آزاد لوگوں کو مسلمان کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ہمارے مشنری کافی وقت اور کثیر روپیہ صرف کر کے بھی بمشکل چند آدمیوں کو عیسائی کرتے ہیں، مگر مسلمان مبلغ بغیر کسی دِقّت کے جمِ غفیر اکٹھا کرتے

---

1. Bondei.

جا رہے ہیں ۔"

گذشتہ پچاس ساٹھ سال سے بیرونی مسلمان بھی یہاں پہنچ گئے ہیں اور انھوں نے تبلیغی کام میں ایک نئی روح پھونک دی ہے ۔ اس وقت خصوصیت کے ساتھ کلیرا ماؤنٹ میں تبلیغ کا سب سے زیادہ زور ہے اور یتیم و لاوارث بچے نہایت کثرت کے ساتھ مسلمان ہو رہے ہیں ۔

پانچواں باب

اشاعتِ اسلام چین میں

افریقہ کے بعد مسلمانوں کی تبلیغی فتوحات کا دوسرا میدان مشرقِ اقصیٰ ہے۔ یہاں بھی محض تاجروں، سپاہیوں اور عام کاروباری مسلمانوں نے محض اپنے طبعی ذوق اور اسلامی جوش کی بنا پر اسلام کی اشاعت کی اور باوجودیکہ انھیں دولت وحکومت کی کبھی تائید حاصل نہ ہوسکی بلکہ اکثر حالات میں دشمنوں کی تلوار کا مظلومانہ مقابلہ کرنا پڑا لیکن پھر بھی انھیں اپنے دین کی اشاعت میں اس قدر زبردست کامیابی حاصل ہوئی کہ اس وقت چین وجزائر ملایا میں ان کی مجموعی آبادی کسی طرح آٹھ نو کروڑ سے کم نہیں ہے۔

چین میں اسلام کی ابتدا دولتِ بنوامیہ کے عہد سے ہوتی ہے۔ اگرچہ خلفائے راشدین ہی کے مبارک زمانے میں وہ عرب تاجر، جن کی بحری تُرکتازیوں نے بحرِ عرب سے لے کر بحرالکاہل تک تمام سمندروں کو چھان مارا تھا، سواحلِ چین پر

اسلام کو لے کر پھیل گئے تھے لیکن زرد قوم سے اسلام کا باقاعدہ تعارف اس وقت ہوا جب دولتِ بنو امیّہ کے عہد میں چینیوں سے سفارتی تعلّقات بھی قائم ہو گئے۔ بعد میں جب بادشاہ سُوان سونگ[1] کو ایک غاصب نے تخت سے محروم کر دیا تو اُس کے بیٹے نے خلیفہ منصُور عبّاسی سے مدد طلب کی اور اُس نے چار ہزار سپاہی اُس کی مدد کو بھیج دیے، جن کی قوّتِ بازو کے طفیل اُس نے دوبارہ تاج و تخت حاصل کیا۔ یہ سپاہی اسلام کے اصلی مُبلّغ تھے۔ انھوں نے وطن واپس آنے کے بجائے چین ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔ یہیں شادی بیاہ کیے اور عام چینی آبادی میں تبلیغِ اسلام کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ چند صدیوں کے اندر کینٹن کا سارا علاقہ اسلام کی روشنی سے معمور ہو گیا۔

اشاعتِ اسلام — منزل بہ منزل

اس واقعے کے چھ سو برس بعد پھر ایک مرتبہ چین میں باہر سے اسلامی عناصر داخل ہوئے اور وہ تمام ملک میں پھیل گئے۔ یہ عرب، ایرانی اور تُرک مہاجرین تھے جو ساتویں صدی ہجری میں منگولی سیلاب سے بہہ کر یہاں چلے آئے تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے سو ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر چین کے اکثر اطراف میں اسلام کی اشاعت ہو گئی اور خصوصیت کے ساتھ شمالی اور مغربی چین میں پورے کے پورے علاقے مُسلمان ہو گئے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں مارکوپولو کا بیان ہے کہ یُنّان[2] کا صُوبہ بڑی حد تک مُسلمان ہو چکا ہے۔ چودھویں صدی کا ایک اور مؤرّخ لکھتا ہے کہ تالیفو کی پوری آبادی مُسلمان ہے۔ جنوبی چین کے متعلق ابنِ بطوطہ لکھتا ہے کہ تمام شہروں

1. Hsuan Tsung. 2. Yunnan.

میں پورے کے پورے محلّے مسلمانوں کے موجود ہیں، جو اپنی پاکیزگی اور تہذیب کے اعتبار سے نہایت ممتاز ہیں۔ مسلمان چینی عورتوں سے شادیاں کرتے اور عام چینیوں سے نہایت عمیق تعلقات رکھتے ہیں، اور اس کی بدولت اسلام بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ پندرھویں صدی میں ایک مسلمان تاجر علی اکبر لکھتا ہے کہ پیکنگ میں تقریباً تیس ہزار مسلمان خاندان آباد ہیں۔ سترھویں صدی کی ابتدا میں چینی یہودیوں کی ایک بہت بڑی جماعت مسلمان ہو گئی۔ اٹھارویں صدی میں کین لنگ نے زنگاریہ کی بغاوت فرو کر کے دس ہزار خاندانوں کو وہاں لے جا کر آباد کیا جو آس پاس کی اسلامی آبادی سے متاثر ہو کر سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ "شیان تنگ"[1] میں ایک قحط کے موقع پر مسلمانوں نے دس ہزار چینی بچّوں کو پناہ دی اور ان سب کو مسلمان کر لیا۔ ایک اور قحط کے موقع پر کوانگ تنگ[2] میں مسلمانوں کو تقریباً دس ہزار چینی بچّے مل گئے جنھیں اسلامی تربیت دے کر پالا گیا۔ اس طرح کے غیر معمولی مواقع کے علاوہ عام حالات میں بھی مسلمان اس کثرت سے اسلام کی اشاعت کرتے ہیں کہ ایک چینی مسلمان سیّد سلیمان کے بقول ہر سال اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کا احصاء کرنا بہت مشکل ہے۔

موجودہ عہد میں[3] بھی چینی مسلمانوں کے اندر تبلیغِ اسلام کا خاص ذوق موجود ہے۔ تاجروں اور صنّاعوں کے علاوہ حکومت کے مسلمان ملازم بھی عمومیّت کے ساتھ اُن حلقوں میں دینِ مبین کی تبلیغ کرتے ہیں جن سے اُنھیں میل جول کا موقعہ ملتا ہے، اور

1. Chantong. 2. Kwang tung. ۳۔ مراد ہے ۱۹۲۵ء کے زمانے میں۔

چینی فوج کے مسلمان افسر اور سپاہی بھی اس فرض سے غافل نہیں ہیں۔ کچھ عرصے سے چینی مسلمانوں نے اپنی پوزیشن کو محسوس کر کے تبلیغِ اسلام کی اہمیت کو زیادہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ پہلے کانسو میں ایک تبلیغی مدرسہ قائم کیا گیا تھا اور اب تقریباً دس صوبوں میں ایسے ہی مدارس قائم ہو گئے ہیں۔ اگر چین میں باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کا شمار کیا جائے تو شاید اُن کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز نہ ہو مگر صرف یہی عالمگیر ذوقِ تبلیغ ہے جس نے انھیں پانچ کروڑ کی عظیم الشان تعداد تک پہنچا دیا ہے اور جس کی بدولت ایک رُوسی مبصر یہ دیکھ کر کانپ اُٹھا ہے کہ اگر اشاعتِ اسلام کی رفتار کا یہی حال رہا تو کچھ عجب نہیں کہ ایک وقت میں مسلمان سیاستِ مشرقِ اقصیٰ کا نقشہ بالکل بدل دیں گے۔[1]

---

[1] اشتراکیت کے سیلاب کے بعد چین میں اہلِ اسلام پر جو مصیبت گزری ہے اس کا واضح اندازہ اُس زمانے کے اور موجودہ زمانے کے حالات کا مقابلہ کرنے سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے وقت وہاں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے زائد تھی لیکن ۱۹۶۱ء کی سرکاری مردم شماری کے مطابق یہ تعداد کم ہو کر صرف ایک کروڑ رہ گئی ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ۔

چھٹا باب

اشاعتِ اسلام، جزائر ملایا میں

جزائرِ ملایا[1] میں اِسلام کے مُبلّغ وُہ عربی اور ہندی تاجر تھے جو بحری استعمار کے میدان میں پُرتگال کے قدم رکھنے سے پہلے، تمام چین اور جزائرِ شرق الہند کی تجارت پر قابض تھے۔ وُہ اسپینیوں اور پُرتگالیوں کی طرح فاتح بن کر نہیں آئے تھے اور نہ تلوار کی مدد سے اپنے مذہب کی اشاعت کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس ایسی بھی کوئی قوّت نہ تھی جس سے وُہ بالآخر قوّت بن کر رہتے۔ وُہ صرف ایک ایمان کی قوّت رکھتے تھے۔ ایک حق و صداقت کی متاع لے کر آئے تھے۔ انھی ہتھیاروں سے اُنھوں نے تمام جزائرِ ملایا کو فتح کیا۔ اُنھی کے بل پر اُنھوں نے حکومتوں کو تسخیر کیا اور اُنھی کی قوّت سے اُنھیں یہ فروغ حاصل ہُوا کہ چھ سو برس کے اندر مجمع الجزائر کی پانچ کروڑ آبادی میں سے چار کروڑ کے قریب مُسلمان ہوگئی۔ قدیم بُت پرستانہ توہّمات نے اُنھیں قدم قدم پر روکا۔ ہسپانیہ اور پُرتگال کی استعماری

---

[1]: مُراد ہیں جزائرِ شرق الہند، جو اَب انڈونیشیا اور ملیشیا کہلاتے ہیں۔ انڈونیشیا کی فیڈریشن میں جاوا، سماٹرا، بورنیو (کالی منٹن)، سلیبس (سُلاویسی)، مغربی نیوگنی (ویسٹ ایریان) اور ہزاروں چھوٹے چھوٹے جزیرے شامل ہیں؛ اور فیڈریشن آف ملیشیا، ملایا کی گیارہ ریاستوں اور برطانوی شمالی بورنیو (صباح) اور سراوک پر مشتمل ہے۔

ہوسنا کی بار بار اُن پر تلوار سونت کر کھڑی ہوگئی اور ہالینڈ کی مسیحی قوت نے اُن کی ہمت شکنی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا مگر کوئی چیز ان کے جذبۂ خدمتِ دین پر غالب نہ آسکی اور انھوں نے اپنی ذہانت، مستعدی، استقلال اور دولت کو اپنی شان و شوکت بڑھانے کے بجائے اپنے مذہب کی قوت بڑھانے میں صرف کر دیا۔ ان کی کوششوں سے گذشتہ چھ صدیوں کے اندر جزائر ملایا میں جس طرح اسلام کی اشاعت ہوئی ہے اس کی داستان نہایت سبق آموز ہے۔

سماٹرا

سماٹرا میں اسلام کی ابتدا اِنجہ سے ہوئی جہاں ایک بزرگ عبداللہ عارف نے سب سے پہلے صدائے حق بلند کی اور اس کے بعد ان کے مرید بُرہان الدین نے پریامان تک تمام مغربی ساحل کو اسلام سے روشناس کرا دیا۔ ۱۲۰۵ء میں پوری ریاست اِنجہ نے اسلام قبول کر لیا اور خود راجہ بھی مسلمان ہوگیا جس کو "جہاں شاہ" کا لقب دیا گیا۔ یہاں سے سواحل کی تجارتی کشتیوں پر اسلام شمالی سماٹرا میں پہنچا۔ پرلاک اور کیپوری میں مسلمانوں کی تجارتی نو آبادیاں قائم ہوئیں۔ چودھویں صدی عیسوی میں مکہ کے چند علمائے شیخ اسماعیل کی سرکردگی میں سماٹرا پہنچے اور اُنھوں نے لمبری سے آرڈنگ تک تمام ساحلی علاقے کو نورِ اسلام سے منور کر دیا۔ آخر سمندرا کا راجہ مسلمان ہوگیا جس کو "الملک الصالح" کا لقب دیا گیا، اور اس کی کوششوں سے پرلاک کی ریاست بھی

لہ ملیشیا یکم فروری ۱۹۴۸ء کو برطانوی تسلط سے آزاد ہوا اور انڈونیشیا کو ہالینڈ کی طویل غلامی سے نجات ۱۷ راگست ۱۹۵۰ء کو حاصل ہوئی۔

مسلمان ہوگئی۔ ابن بطوطہ اپنی سیاحت کے دوران میں جب یہاں پہنچا تو "الملک الصالح" کا بیٹا "الملک الظاہر" حکمران تھا اور سلطان محمد تغلق سے اس کے سفارتی تعلقات قائم تھے۔

پالمبانگ میں ہندو مذہب کا اثر سب سے زیادہ قوی تھا۔ پندرھویں صدی کے وسط میں راڈن رحمت نے جو جاوا کا سب سے بڑا اسلامی مبلغ تھا یہاں اسلام کی اشاعت کی اور اس کے بعد بھی اسلام کا اثر پھیلتا رہا۔ مگر اس علاقے کو صحیح معنوں میں اسلام کی نعمت اس وقت میسر ہوئی ہے جب یہاں ہالینڈ کی حکومت قائم ہونے کے بعد مسلمانوں نے عیسائی مشنریوں کے مقابلے میں انتھک کوششیں شروع کی ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کی ابتدا سے یہاں کی بت پرست آبادی نہایت کثرت کے ساتھ اسلام قبول کر رہی ہے۔

جنوبی سماٹرا میں اسلام کی اشاعت سب سے آخر میں ہوئی۔ یہاں اسلام کا پہلا داعی ایک جاوی سردار مِنَک کمالا بومی تھا جس نے بنٹام میں اسلام قبول کیا، مکہ جاکر علوم اسلامیہ کی تحصیل کی اور پلمبانگ میں نہایت کثرت سے بت پرست قبائل کو مسلمان کیا۔ اب تمام جزیرہ سماٹرا میں صرف ایک بٹک ایسا مقام رہ گیا ہے جہاں قدیم بت پرستی کا اثر ہے۔ اس علاقے نے اس زمانے میں تو اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار نہیں کی جب کہ وہ ہر طرف سے طاقتور اسلامی ریاستوں کے درمیان گھرا ہوا تھا مگر اب ہالینڈ کی سخت گیر مسلم کش حکومت قائم ہونے کے بعد وہ اسلام کی

اطاعت قبول کر رہا ہے۔ ہالینڈ نے تلوار کی قوت سے اسلام کی اشاعت کو روکنے کی کوشش کی مگر اس سے مسلمانوں کا جوشِ تبلیغ بہت زیادہ تیز ہو گیا اور انھوں نے مسیحی مبلغین کو شکستِ فاش دی۔ چنانچہ خود ایک مشنری کا بیان ہے کہ ایک موقعہ پر پورے دو گاؤں جو بپتسمہ لے چکے تھے، دفعتاً مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح ایک اور جگہ صرف ایک امامِ مسجد کی کوشش سے سینیروک کا پورا ضلع مسلمان ہو گیا۔ ایک اور مبلغ کے متعلق عیسائی مشنریوں کا بیان ہے کہ اس نے دس سال کے عرصے میں بت پرستوں کے ایک قبیلہ کو عیسائیت کے اثر سے نکال لیا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود حکومتِ ہالینڈ کے سرکاری ملازم بھی تبلیغ اسلام کا کام کرتے ہیں اور حکومت اس کام کی مخالف ہونے کے باوجود انھیں روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

جزیرۂ سماٹرا سے اسلام کا اثر جزیرہ نمائے ملایا میں پہنچا۔ بارھویں صدی عیسوی میں سماٹرا کے بہت سے مسلمان تجارت کی غرض سے سنگاپور میں جاکر آباد ہوئے اور ایک صدی بعد انھوں نے ملکا کی بندرگاہ میں اپنی نوآبادی قائم کی۔ ان کی کوششوں سے سواحل کی اکثر تجارتی آبادی مسلمان ہو گئی اور ان کے ذریعہ اندرونِ ملایا اسلام کی اشاعت ہوئی۔ چودھویں صدی عیسوی میں یہاں کا راجہ بھی ایک عرب تاجر سیدی عبدالعزیز کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا اور اس کا نام سلطان محمد شاہ رکھا گیا۔ سولھویں صدی کی ابتدا میں ملایا کی جنوبی ریاست کوبڈا بھی اسلام کے اثر میں آگئی اور ۱۵۰۱ء میں وہاں کے راجہ پیرا اونگ مہاونگسا نے ایک مسلمان عالم شیخ عبداللہ

کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا جس کا نام سلطان مُظفّر شاہ رکھا گیا۔ اس راجہ نے
اپنی ساری زندگی اسلام کی اشاعت میں صرف کردی اور مرنے سے پہلے ریاست
کوٹیدا کے ایک بڑے حصّے کو بُت پرستی کی لعنت سے آزاد کر دیا۔

ملایا سے اسلام کا اثر سیام پہنچا اور سنگاپور کے مسلمان تاجروں نے اسے
ہند چینی تک پہنچا دیا۔ اس وقت ان دونوں ممالک میں اسلام کا جتنا اثر پایا جاتا
ہے وُہ سب انہی تاجروں کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

جاوا

جزائر ملایا میں ہندویت اور بُت پرستی کا سب سے زیادہ اثر جزیرۂ جاوا میں تھا۔
مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیمات کے باوجود اوہام پرستی کے عقائد صدیوں تک ان لوگوں کی
طبیعتوں پر مستولی رہے اور منو کی دھرم شاستر کے رواج کا تو ۱۷۶۸ء تک پتہ چلتا
ہے۔ لیکن ان تمام عمیق اور راسخ اثرات کو اسلام کے خاموش مبلّغوں نے صدیوں
کے اندر بالکل دُور کر دیا اور اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ تمام جزیرۂ جاوا کی آبادی،
باستثنائے قلیل، مسلمان ہو چکی ہے اور جاوی مسلمانوں کا تشغفِ دینی شرق الہند
کے جزائر میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہے[1]۔

اس عظیم الشّان کام کی ابتدا ایک جاوی تاجر حاجی پُرُوانے کی جو پاجاجارن
کے راجہ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس نے تخت و تاج اپنے چھوٹے بھائی کے لیے چھوڑ
دیا اور خود مالِ تجارت لے کر ہندوستان پہنچا۔ یہاں آکر متاعِ دُنیا کے بجائے

---

[1] یہ ذکر ۱۹۲۵ء کا ہے۔

متاعِ آخرت اُسے نصیب ہوگئی اور اُس نے سب کچھ چھوڑ کر اپنی زندگی کا مقصد صرف اِس نعمت سے اپنے ہم وطنوں کو بہرہ ور کرنا قرار دے لیا۔ چنانچہ ایک عرب عالم کو لے کر جاوا پہنچا اور تمام عمر اسلام کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے بعد عربی اور ہندی تاجروں اور سیاحوں کی توجہ اِس جزیرہ کی طرف منعطف ہوگئی اور انھوں نے کثرت سے یہاں آکر سواحل پر اسلام کی اشاعت شروع کر دی۔ اِس قسم کے سیاحوں کی بڑی جماعت چودھویں صدی میں مولانا سیّد ابراہیم کی زیرِ قیادت گریسک[1] میں وارد ہوئی اور اس کو جاوا کی تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ چرمن کے راجہ نے اسلام قبول کر لیا اور یہیں سے قریبی ریاستوں میں اسلام پھیلنا شروع ہو گیا۔

راڈن رحمت کا ظہورِ رحمت

پندرھویں صدی میں جزیرہ جاوا کا سب سے بڑا اسلامی مبلّغ راڈن رحمت پیدا ہوا جس نے اسلام کو غربت کے بوریئے سے اُٹھا کر بادشاہی اور بالادستی کے تخت پر پہنچا دیا۔ اُس نے شاہانہ ناز و نعم میں پرورش پائی تھی اور اگر چاہتا تو خود بھی کسی تخت کا مالک بن جاتا مگر اُس کے دِل میں اپنی نفسانیت کی خدمت کے بجائے اپنے مذہب کی خدمت کا جوش بھرا ہوا تھا۔ اِس لیے اپنی زندگی کا مقصد وحید صرف تبلیغ و اشاعتِ اسلام کو قرار دیا اور "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝"[2] کے ارشادِ ربّانی کے مطابق سب سے پہلے اپنے خاندان سے تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اُس نے اپنے

---

1. Gresik.

[2] ترجمہ: اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ (الشعراء: ۲۱۴)

نانا کو جو جمپا کا راجہ تھا، اسلام کی دعوت دی۔ پھر "پالم بانگ" پہنچا اور اپنے رشتے کے بھائی آریہ دامر کو جو راجہ کی طرف سے وہاں کا گورنر تھا مسلمان کر لیا۔ اس کے بعد مولانا جمادی الکبریٰ کی معیت میں "ماجاپاہت"[1] پہنچا اور راجہ کو جو اس کا خالو تھا، اسلام کی دعوت دی۔ راجہ نے خود تو اسلام قبول نہیں کیا مگر اسے امپل کا گورنر مقرر کر کے پوری آزادی کے ساتھ اشاعتِ اسلام کی آزادی دے دی چنانچہ اس نے اپنے زمانۂ گورنری میں امپل کے تقریباً تین ہزار خاندانوں کو مسلمان کیا اور اسلامی مبلّغین کی ایک بڑی جماعت کو اطراف و جوانب کے جزیروں اور ریاستوں میں پھیلا دیا۔

شیخ خلیفہ حسین، جس نے مدورا کو اسلام کی روشنیوں سے معمور کر دیا تھا اسی کا فرستادہ تھا۔ مولانا اسحاق جنھوں نے ریاست "بالمنگن" میں اسلام کی اشاعت کی اسی کے فیض یافتوں میں سے تھے۔ راڈن پاکو[2]، جس نے گریسک کے علاقہ میں بُت پرستی کا کھوج مٹا دیا تھا، اسی کے فیضِ تربیت کا پروردہ تھا۔ خود اس کے دونوں بیٹے بھی جاوا کے مشہور اسلامی مبلّغین میں شمار ہوتے ہیں اور اس کے دو قریبی رشتہ دار راڈن پٹہ[3] اور راڈن حسین، جاوا کی تاریخ میں اِس حیثیت سے بہت مشہور ہیں کہ اُنھوں نے ہندو مذہب کی سب سے بڑی قوت یعنی "ماجاپاہت" کو قطعی طور پر مسخّر کر لیا۔ راڈن حسین نے "ماجاپاہت" کی فوج کو سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے اسلام کی طرف دعوت دی اور راڈن پٹہ نے ۱۴۷۸ء میں کُفر کو آخری شکست دے کر "ماجاپاہت" کو ایک اسلامی حکومت بنا دیا۔

مغربی جاوا میں اشاعتِ اسلام کا کام اس سے بھی زیادہ مشکل تھا کیونکہ

---

1. Majapahit. 2. Raden Paku. 3. Raden Patah.

وہاں کے ہندو عام جاویوں سے بھی زیادہ راسخ العقیدہ تھے۔ اگرچہ وہاں مولانا حسن الدین چیریبونی[1] جیسے زبردست اسلامی مُبلّغین نے بڑی سرگرمی سے اسلام کی تبلیغ کی تھی لیکن ہندو مت ایک عرصے تک دینِ الٰہی کا مقابلہ کرتا رہا؛ یہاں تک کہ سولھویں صدی میں حق کی آخری فتح ہوئی اور "پاجاجارن" کی ہندو ریاست کُلیتاً مُسلمان ہو گئی۔

اس طرح بارھویں صدی سے شروع ہو کر سولھویں صدی تک چار سو برس کے عرصے میں جزیرۂ جاوا کی تسخیر مکمل ہو گئی اور بغیر کسی قتل و خون کے محض تبلیغ و تلقین کی قوّتوں سے ہندو مت نے اسلام کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دیے۔

مجموعۂ جزائر ملکّا

جاوا کے بعد اسلامی قوّت کا دُوسرا مخزن "مجموعۂ جزائر ملکّا" ہے۔ یہاں اسلام کی اشاعت بہت بعد میں ہوئی ہے۔ بلکہ اکثر مقامات پر تو ہسپانی اور پرتگالی تجارت اور اسلام دونوں ساتھ ساتھ پہنچے اور پُرامن مُسلمان تاجروں نے جنگ آزما مسیحیّت کے مقابلے میں اپنے مذہب کی کامیاب تبلیغ کی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے درمیان یہاں جاوا اور ملایا کے تاجروں نے، جو لونگ اور مسالے کے جہاز بھر کر لاتے تھے، اسلام کی اشاعت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصے میں اُن کے ذوقِ تبلیغ نے یہ کرشمہ دکھایا کہ پُورے مجموعۂ جزائر میں اسلام پھیل گیا اور چار زبردست اسلامی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ایک ٹرنیٹ[2] کی حکومت تھی جس کا سُلطان ٹرنیٹ المّاہرہ کے ایک معقول حصّہ پر حکمران تھا۔ دُوسری ٹیڈور کی حکومت تھی،

---

[1] Cheribon : جاوا کا ایک ساحلی مقام۔

2. Ternate.

جس میں جزیرۂ ٹیڈور[1]، الماہرہ[2] کا ایک حصّہ، سیرام کا ایک حصّہ اور نیوگیانا کا مغربی حصّہ شامل تھا۔ تیسری حکومت سُلطان گلولو[3] کی تھی جو وسطِ الماہرہ اور شمالی سیرام پر حکومت کرتا تھا اور چوتھی تنجان[4] کی حکومت تھی جس کا اقتدار جزیرۂ تنجان اور جزائر ادبی[5] پر حاوی تھا۔ یہ چاروں سلطنتیں کچھ مدّت تک بہار دکھانے کے بعد مسیحی استعمار کی بادِ سموم سے مرجھا کر فنا ہو گئیں مگر اسلام کا وجود نہ ان کا منّت کش تھا اور نہ اُن پر انحصار رکھتا تھا۔ چنانچہ اب[6] ہالینڈ وغیرہ کی مسیحی طاقتوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد بھی جزائرِ ملکا میں نہایت تیزی کے ساتھ اسلام پھیل رہا ہے اور عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ جب اسلام کے سوا وہاں اور کوئی مذہب نہ رہے گا۔

ان جزائر میں سب سے پہلے جزیرۂ ٹیڈور اسلام کا حلقہ بگوش ہوا۔ پندرھویں صدی میں ایک عرب تاجر شیخ منصور نے یہاں کے راجہ کو مسلمان کر کے اُس کا نام جمال الدین رکھا۔ ۱۵۲۱ء میں جب ہسپانوی مستعمرین (آبادکاروں) کی دوسری مُہم یہاں پہنچی ہے تو جمال الدین کا بیٹا سلطان منصور حکمران تھا اور اسلام کو پھیلے ہوئے صرف پچاس سال گذرے تھے۔ پرتگالی تاجروں کا بیان ہے کہ ٹرنیٹ میں ٹیوڈور سے بھی پہلے اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۵۲۱ء میں جب پرتگالی مُہم وہاں پہنچی تھی، اُس کا مؤرخ لکھتا ہے کہ یہاں اسلام کو پھیلے ہوئے اسّی برس گزر چکے ہیں۔ اس جزیرے میں اشاعتِ اسلام کا عجیب قصّہ ہے۔ ایک جاوی تاجر داتو ملّا حسین جو اپنی تجارت

1. Tidor. 2. Halemahera. 3. Gilolo. 4. Batjan. 5. Obi.

[6] یعنی ۱۹۲۵ء میں۔

کے سلسلے میں یہاں آکر مقیم ہوا تھا، روزانہ صبح کو بلند آواز سے قرآن پڑھتا تھا۔ اس کی آواز پر بت پرست عاشق ہو گئے اور کثرت سے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ تھوڑی مدت میں اس نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا کر لی اور آخر ۱۴۹۵ء میں خود راجہ نے بھی گریسیک جاکر اسلام قبول کر لیا۔

امبوئینا میں ایک مقامی تاجر "پاٹی پوٹہ"[1] نے اسلام کی روح پھونکی اور جاوا سے اس متاعِ گراں بہا کو لاکر تمام سواحلِ امبوئنا میں اسے پھیلا دیا۔ یہ پرتگالی استعمار کے ابتدائی عروج کا زمانہ تھا۔ پرتگالیوں نے تلوار کی قوت سے اس مذہب کی ترقی کو روکنا چاہا جس سے دراصل وہ صلیبی لڑائیوں کا بدلہ لینے کے لیے نکلے تھے مگر ان کے سخت مقابلے کے باوجود دینِ حق کی ترقی پر کوئی اثر نہیں پڑا، بلکہ عام باشندوں میں اس کو کچھ زیادہ ہی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ جب سولھویں صدی کے اواخر میں پرتگال اپنے اندرونی خدشوں میں مبتلا ہوا تو امبوئنا والوں نے تمام مسیحی مشنریوں کو مار مار کر نکال دیا اور جوق در جوق اسلام کے دائرے میں داخل ہونے لگے۔ ان جزائر کے ساتھ تجارتی تعلقات ہونے کی وجہ سے ملکا کے بقیہ جزائر بھی مسلمان ہو گئے۔

جزیرہ بورنیو

۱۵۲۱ء میں گلولو کا راجہ مسلمان ہوا۔ اس صدی میں بورنیو بھی پورا اسلام سے فیضیاب ہوا۔ سب سے پہلے ریاست "بنجر ماسن"[2] نے اسلام قبول کیا۔ پھر شمالی

1. Pati Putah. 2. Banjarmasin.

بورنیو کی ریاست برونائی مسلمان ہوئی۔ اس کے بعد ۱۵۵۰ء میں پالمبانگ کے تاجروں نے سوکدنا[1] کی ریاست میں اسلام پھیلایا اور ۱۵۹۰ء میں بورنیو کا سب سے طاقتور راجہ مسلمان ہوگیا، جس کا نام سلطان محمد صفی الدین رکھا گیا۔ ۱۶۰۰ء میں جب ایک مغربی سیاح بورنیو پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ تمام سواحل مسلمان ہو چکے ہیں اور صرف اندرونی علاقے میں کفر و بُت پرستی کا اثر باقی ہے۔ اٹھارویں صدی کی ابتدا سے اندرونِ بورنیو میں بھی اسلام کی اشاعت شروع ہوگئی۔ ایک طرف سرمایہ دار اور منظم مسیحی جماعتیں اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہی ہیں اور دوسری طرف منتشر اور بے زر مسلمان تاجر اپنے دین کی طرف بُلا رہے ہیں مگر دُنیا یہ دیکھ کر حیران ہے کہ مسیحی ناکام ہیں اور مسلمان کامیاب۔ انھوں نے چند سال کی کوششوں سے شمالی بورنیو کی ایک بہت بڑی قوم "ایدان" کو مسلمان کر لیا ہے اور وسط بورنیو کی "ڈائک" قوم بھی مسیحیت کے مقابلے میں اسلام کو زیادہ پسند کرتی ہے۔

جزیرہ سلیبس

جزیرہ سلیبس[2] میں بھی اسلام کی اشاعت اسی عام اصول کے مطابق ہوئی کہ پہلے جاوی اور ملائی تاجر اسلام کو لے کر سواحل پر پہنچے اور پھر دیسی تاجروں کے ذریعے وہ اندرونِ ملک میں پہنچ گیا۔ ۱۵۴۰ء میں جب پرتگالی مستعمرین یہاں پہنچے تو اسلام کی ابتدا ہو رہی تھی اور صرف گوا[3] میں چند مسلمان رہتے تھے۔ ساٹھ سال کے اندر اندر اسے اتنی ترقی ہوئی کہ تمام سواحل مسلمان ہو گئے اور مکاسر کی ریاست نے

1. Sukadana. 2. Celebes. 3. Gova.

راجہ سمیت اسلام قبول کیا مگر کاسر سے الفر اور بوگی قوموں میں اُس کی اشاعت ہُوئی اور مؤخر الذکر قوم پر اس کا یہ اثر ہُوا کہ اس کی تمام فطری قابلیتیں جاگ اُٹھیں۔ اُس کی ذہانت، جفاکشی اور مستعدی نے اُسے جزائر ملکا کی سب سے زیادہ مہذب قوم بنا دیا اور اب وُہ ایک مُبلّغ قوم کی حیثیت سے شرق الہند میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ نیو گیانا سے لے کر سنگاپور تک اس کے تاجر اپنے جہاز لے کر پھرتے ہیں اور اُن کے اثر سے نہایت تیزی کے ساتھ اسلام پھیل رہا ہے۔ سُمباوا، لومبوک، جزیرۂ چوب صندل، وغیرہ تمام جزائر میں اس کی بدولت دینِ مُبین کی اشاعت ہُوئی اور خود سلیبس میں اس نے مسیحیت کو نہایت زبردست شکست دی۔ اٹھارویں صدی میں مسیحی مبلغین نے بولانگ اور مونگونڈو کے راجہ کو عیسائی کر لیا تھا اور اس کے اثر سے پُوری ریاست عیسائی ہو گئی تھی مگر بوگی تاجروں نے ایک صدی کے اندر اندر اُسے عیسائیت کے چنگل سے آزاد کرا لیا اور آخر ۱۸۴۴ء میں خود راجہ جیکوبس نے اِسلام قبول کر لیا۔

جزائر فلپائن

نہتّے اِسلام کے اعجازِ تسخیر کا سب سے بڑا مظاہرہ جزائر فلپائن میں ہُوا۔ یہاں اسلام کی ابتدا ملایا کے ایک تاجر شریف کابنگ سُوان نے کی تھی جو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مِنڈاناؤ میں آ کر آباد ہُوا تھا۔ یہاں اُس نے کثرت کے ساتھ اہلِ فلپائن کو مسلمان کیا اور اس کے بعد مسلمان تاجروں کی آمد اور اسلام کی اشاعت کا ایک طویل سلسلہ

ا؎ یہ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ 2 Lombok. 3. Bolaang. 4. Mongondou.

شروع ہو گیا۔ اِن وحشی قبائل میں اسلام کی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ ۱۵۲۱ء میں جب ہسپانوی مستعمرین وہاں پہنچے تو اُنھوں نے مسلمانوں اور کافروں کی معاشرت، تہذیب اور اخلاق میں ایک نمایاں امتیاز پایا اور اُنھیں حیرت ہوئی کہ اس قلیل عرصے میں بُت پرست وحشیوں کی زندگی میں یہ عظیم انقلاب کیونکر پیدا ہو گیا۔ چونکہ یہاں اسلام کا اثر بہت حدیث العہد (تازہ) تھا اِس لیے ہسپانیہ نے اسے مٹا کر مسیحیت کو پھیلانے کے لیے نہایت سخت کارروائیاں شروع کیں اور تلوار کے زور سے قبائل کو عیسائی بنانے لگے۔ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے مہذّب ایام کی ابتدا تک جاری رہا اور اسپین نے مذہب کی خاطر ظلم و ستم ڈھانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھّی۔ لیکن اس کے باوجود وہاں مسیحیّت کے مقابلے میں اسلام کی اشاعت نہایت تیزی کے ساتھ ہوئی کیونکہ فلپائن کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں تمام اطراف سے بھاگ بھاگ کر منڈاناؤ اور سولو کی اسلامی ریاستوں میں آتے تھے اور فوج در فوج اسلام قبول کرتے تھے۔ اور پھر حیرت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں جب یہاں امریکہ کا تسلّط قائم ہوا اور مذہبی تشدّد کا دور ختم ہو گیا تو اشاعتِ اسلام کی وہ تیز رفتاری بھی باقی نہیں رہی۔ تاہم زمانۂ امن میں مسلمان تاجر نہایت کثرت کے ساتھ اطراف میں پھیل گئے اور جدید ترین خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں خاموش اسلامی تبلیغ کا سلسلہ نئے سرے سے جاری ہو گیا ہے۔

نیو گنی

نیو گیانا میں اِسلام کی اشاعت جدید ترین عہد سے تعلّق رکھتی ہے اور زیادہ تر

سواحل تک محدود ہے ابتداً اُس کا مغربی علاقہ سلطان تنبجان کے تابع فرمان تھا اِس لیے سولھویں صدی میں شمال مغربی گیانا میں اسلام کا اثر زیادہ وسعت اختیار کر گیا۔ ۱۶۰۶ء میں مسلمان تاجر اُسے مغرب کی طرف بھی لے گئے اور جزیرہ نمائے اُونین[1] کی بت پرست آبادی میں اسلام کو پھیلا دیا مگر ان اطراف میں اشاعت اسلام کا اصل زمانہ اُنیسویں صدی کا ہے۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں جزیرہ آدی[2] نے اسلام قبول کیا اور بیسویں صدی کی ابتدا میں سیرام اور گورام کے مسلمان تاجروں نے پلاؤ اور غیرہ جزائر کو اسلام سے روشناس کیا۔ جزائر کائی[3] میں انیسویں صدی کے وسط تک مسلمانوں کا نام و نشان نہ تھا۔ صرف جزیرہ بندا[4] کے چند تاجر رہا کرتے تھے۔ دفعتاً ۱۸۷۰ء میں تبلیغ کا کام شروع ہوا اور تھوڑی ہی مدت میں مدورا، جاوا اور بامی کے مسلمان تاجروں نے اس قدر کثرت کے ساتھ جزائر کائی کے باشندوں کو مسلمان کر لیا کہ اس وقت وہاں مسلمانوں کی تعداد سولہ ہزار (۱۶۰۰۰) سے متجاوز ہے جو کل آبادی کے نصف کے برابر ہے۔

مجمع الجزائر ملایا میں اسلام کی عظیم الشان کامیابی، جس کا مختصر سا حال آپ نے ان سطور میں بلاحظہ کیا ہے، چھ صدیوں کی خاموش مساعی کا نتیجہ ہے جو زیادہ تر تاجروں اور عام سیاحوں نے انجام دی ہیں۔ اُن کے پاس کوئی تلوار یا حاکمانہ قوت نہیں تھی، بلکہ صرف تبلیغ دینِ الٰہی کا ایک زندہ و تابندہ ذوق و شوق تھا، جس نے انھیں اپنے سفر کے خطرات و مہالک اور تجارتی منافع کی زر پرستانہ زندگی میں بھی مذہب کی خدمت کا والہ و شیدا بنائے رکھا اور اُن کے اندر ایسی شیفتگی پیدا کر دی

1. Onin. 2. Adi. 3. Kai. 4. Banda.

کہ انھوں نے تمام دُوسرے مقاصد کو ثانوی درجہ دے کر صرف دعوتِ الی الخیر اور تبلیغِ دینِ مُبین کو اپنا اوّلین مقصد قرار دیا۔ جدید دَور میں بھی، جبکہ تمام دُنیا کے مُسلمان باستثنائے افریقہ فرض سے غافل ہو گئے ہیں، شرقُ الہند کے عام مُسلمانوں میں یہ ذوق باقی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اب بھی وہاں تاجروں اور کاروباری آدمیوں کے علاوہ حکومتِ ہالینڈ کے سرکاری ملازم تک تبلیغِ اسلام کے فرائض انجام دیتے ہیں اور ان لوگوں نے ملائی زبان کو اس قدر کثرت کے ساتھ اسلامی لٹریچر سے بھر دیا ہے کہ جو غیر مُسلم سرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے اس کو سیکھتے ہیں وُہ اسلامی تعلیمات سے ضرور متاثر ہوتے ہیں اور اکثر اوقات مُسلمان ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

ساتواں باب

دعوتِ عمل

یہ طویل داستان سرائی محض اس لیے نہیں تھی کہ اس سے کچھ افسانہ ہائے پارینہ کو چھیڑنا مقصود تھا بلکہ اس سے دراصل ہم یہ بتانا چاہتے تھے کہ اسلام کی دینی اور دنیاوی قوت کا اصلی سرچشمہ وہی **دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر** ہے جس پر اس کی ساری زندگی کی بنیاد رکھی گئی تھی اور جس کے لیے مسلم نام کی ایک قوم کو حضرت حق جل شانہ نے پیدا کیا تھا اور چونکہ پیغام کی فطرت اس بات کو چاہتی ہے کہ اسے مرسَل الیہ تک پہنچایا جائے اس لیے تبلیغ خود اسلام کی فطرت میں شامل ہے۔ اسلام حقیقت میں ایک الٰہی پیغام ہے جس کی مخاطب کرۂ ارض کی تمام بشری مخلوقات ہے اور ہر شخص جس تک یہ آسمانی برکتوں کا پیغام پہنچ جائے اس امر پر عنداللہ مامور ہے کہ اپنے بنی نوع کے زیادہ سے زیادہ افراد تک اس کو پہنچا دے۔ یہی حقیقت تھی جس کو آیتِ کریمہ

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ[1]

میں ظاہر کیا گیا تھا، اور یہی ایک مقصد تھا جسے پورا کرنے کے لیے اللہ عزّ وجل نے مسلمانوں کی قوم کو پیدا کیا تھا کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ[2]

اس مأموریت کے احساس نے اسلام کی تیرہ سو سالہ زندگی میں جو حیرت انگیز کرشمے دکھائے ہیں اُن کا ایک نہایت مختصر سا خاکہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت خوب روشن ہو گئی ہو گی کہ جن مسلمانوں میں اپنے مسلمان ہونے کی ذمّہ داری کا احساس موجود تھا انھوں نے کس طرح "اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ"[3] کے امرِ الٰہی پر عمل کرتے ہوئے محض تلقین و تبلیغ کی قوّت سے ایک دُنیا کو اسلام کے لیے مسخّر کر لیا۔ **افریقہ** کے وسیع برّاعظم میں بغیر کسی جبر و لالچ اور مکر و دغا کے جس طرح کروڑوں آدمی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے، **چین** میں بغیر کسی مادّی اور جبّاری قوت کے جس طرح آبادیوں کی آبادیاں اسلام کی تابع فرمان بن گئیں، جزائرِ ملایا میں نہتّے اور بے زور تاجروں کے ہاتھوں جس طرح ۵/۴ آبادی خدائے واحد کی پرستار بن گئی، **تاتارستان** کے مسلم کش اور خونخوار وحشیوں کو ضعیف اور نازک عورتوں اور بے نوا درویشوں

---

[1] ترجمہ: دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (آلِ عمران: ۱۱۰)

[2] ترجمہ: تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ (آلِ عمران: ۱۰۴)

[3] ترجمہ: اے نبیؐ! اپنے ربّ کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ (النحل: ۱۲۵)

نے جس طرح اسلام کے آستانۂ رحمت پر لاکر جھکا دیا اُس کی بصیرت افروز داستان ہم نے اسی احساس کے کرشمے دکھانے کے لیے اپنے برادرانِ ملت کے سامنے پیش کی ہے اور اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اُن میں بھی کسی طرح یہ احساس جاگ اُٹھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی تبلیغی سرگرمیاں

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے زمانے میں مسلمانانِ ہند کی اسلامی حمیت کو جو دلگداز صدمات پہنچے تھے انھوں نے کچھ عرصے کے لیے ان کی دینی حسیات کو بیدار کر دیا تھا اور اس کی بدولت ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً چالیس سال تک اشاعتِ اسلام کا کام نہایت تیزی کے ساتھ ہوتا رہا، مگر افسوس کہ بعد میں استیلائے کفار کے اثر سے وہ دینی احساس اور وہ ذوقِ تبلیغ ختم ہوگیا اور خدمتِ دین کا وہ عام جوش جو کچھ عرصے کے لیے پیدا ہوگیا تھا آپس کی کفر بازیوں اور باہمی جنگ و فساد میں کام آنے لگا۔ اُنیسویں صدی کے نصفِ آخر کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ حیرت انگیز واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ اس زمانے میں کوئی باقاعدہ تبلیغی نظام قائم نہ ہونے کے باوجود نو مسلموں کی تعداد میں ہر سال دس ہزار سے لے کر چھ لاکھ تک اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس زمانے میں علماء اور واعظین کی ایک بہت بڑی جماعت ایسی پیدا ہوگئی تھی جس نے اپنی زندگی تبلیغِ دین کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنی انفرادی حیثیت میں شہر در شہر پھر کر سینکڑوں آدمیوں کو مشرف باسلام کیا تھا۔ ان کے علاوہ عام کاروباری

مسلمانوں میں بھی یہ ذوق اس قدر پھیل گیا تھا کہ دفتروں کے ملازم اور معمولی دوکاندار تک اسلام کی اشاعت کرتے تھے۔ چنانچہ **انجمن حمایتِ اسلام** کی پُرانی رپورٹوں میں ہم مدارس کے اساتذہ، سرکاری محکموں کے ملازموں، چھوٹے چھوٹے تاجروں حتیٰ کہ ایک اونٹ گاڑی والے تک کو اپنے دین کی اشاعت میں مشغول پاتے ہیں۔

لیکن اب ....

موجودہ دور میں اشاعتِ اسلام کی سست رفتاری کی وجوہ پر اگر غور کریں تو یہ بات بالکل صاف نظر آتی ہے کہ اس کی ذمہ داری صرف ہماری اپنی ہی غفلت اور دینی بے حسی پر عائد ہوتی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ اس کی فطرت میں کوئی تغیّر نہ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے؛ البتہ ہم بدل گئے ہیں۔ ہماری زندگی بدل گئی ہے۔ ہمارے جذبات و حسیات بدل گئے ہیں، اور یہ سب تنزّل اسی کا نتیجہ ہے۔ پس آج اگر ہندوستان[1] میں اشاعتِ اسلام کا مسئلہ ایک نازک صورت اختیار کر گیا ہے تو اس کا صحیح حل یہ نہیں ہے کہ ہم کانفرنسوں پر کانفرنسیں منعقد کریں، انجمنوں پر انجمنیں بنائیں، رسالوں پر رسالے شائع کریں اور محض شور و شغب میں اپنا وقت ضائع کر دیں؛ بلکہ اس کا اصلی حل یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو مسلمان بنائیں، اُن میں صحیح اسلامی رُوح پھونک دیں؛

---

[1] مُراد ہے متحدہ ہندوستان۔

اُن کی زندگیوں کو خالص اسلامی زندگی کے قالب میں ڈھال دیں، اُن کے اندر سے اُن تمام باطل عقائد، مُبتدعانہ رسُوم اَور غلط عادات کو دُور کر دیں جو صدیوں تک ایک مُشرک قوم کے ساتھ رہتے رہتے پیدا ہو گئی ہیں اور اُن کے اندر مذہبیت کا ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیں جو ہر مُسلمان کو اپنے دین کا ایک سرگرم مُبلّغ بنا دے۔

ہم نے جگہ جگہ اِس بات پر زور دیا ہے کہ مُسلمانوں نے کبھی عیسائیوں کی طرح مشنری سوسائٹیاں بنا کر کام نہیں کیا۔ اِس سے مُراد یہ نہیں ہے کہ ہم تنظیم کے ساتھ کام کرنے کے مُخالف ہیں بلکہ دراصل مُراد یہ ہے کہ یہ کام محض ایک جماعت یا چند جماعتوں کا نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے مُسلمانوں میں تبلیغ دین کے ایک ایسے عام ذوق کی ضرورت ہے کہ ہر مُسلمان اپنے آپ کو اس مقدّس کام کے لیے مامُور سمجھنے لگے۔

محض تبلیغی جماعتیں یا ہمہ گیر ذوقِ تبلیغ؟

اگر عام مسلمان اِس ذوق سے بے بہرہ رہیں اور محض ایک انجمن یا چند انجمنوں پر یہ کام چھوڑ دیا جائے تو ہم کبھی غیر مُسلموں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر جگہ مُسلمانوں کا عام ذوقِ تبلیغ ہی فتح و کامرانی سے سرفراز ہوا ہے۔ اگر افریقہ میں مُسلمانوں کا یہ عام ذوق نہ ہوتا اور صرف چند انجمنیں ہی فریضۂ تبلیغ کو انجام دینے کے لیے چھوڑ دی جائیں تو عیسائیوں کی بدرجہا زیادہ طاقتور اور دولتمند سوسائٹیوں کے مقابلے میں انھیں قیامت تک وُہ کامیابی نصیب نہیں

ہو سکتی تھی جس پر آج ساری مسیحی دُنیا انگشت بدنداں رہ گئی ہے۔ اسی طرح اگر مجمع الجزائر ملایا میں عام تاجروں اور سیاحوں کا جذبۂ خدمتِ دینی کام نہ کرتا اور صرف وُہ چند عربی اور ہندی واعظین اور علمأ ہی دعوتِ اسلام کا فرض انجام دیتے جو وقتاً فوقتاً وہاں پہنچتے رہے تھے تو شاید آج بحرالکاہل کے ساحلوں پر اذان کی وُہ گونج اس کثرت سے سُنائی نہ دیتی جو آج بُت پرستی اور مسیحی استعمار کی متحدہ مزاحمت کے باوجُود سنائی دے رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوتِ اسلام ایک فرضِ کفایہ ہے جس کے لیے کسی ایک جماعت کا کھڑا ہو جانا تمام اُمّت کے لیے کفایت کرتا ہے لیکن شریعت کی یہ رُخصت محض مسلمانوں کی آسانی کے لیے ہے نہ کہ اُنھیں دینی خدمات سے بالکل سبکدوش اور بے پروا کر دینے کے لیے۔ اس رُخصت کا مطلب اگر کچھ ہے تو وُہ صرف یہ ہے کہ یہ فرض عائد تو تمام مسلمانوں پر ہوتا ہے، جسے سب کو ادا کرنا چاہیئے، لیکن کم از کم ایک جماعت تو ایسی ضرور رہنی چاہیئے جو ہمیشہ بالالتزام اسے ادا کرتی رہے اور وہ جماعت یقیناً علما و صُلحائے اُمّت کی جماعت ہے۔

پس ہمارے نزدیک اِسلام کی اشاعت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم غیر مُسلموں کو مخاطب کرنے کے بجائے خُود مُسلمانوں کو مخاطب کریں اور اُن میں اس قسم کی مذہبی رُوح پھونک دیں کہ ہر مُسلمان ایک مُبلّغ بن جائے۔ اس سے نہ صرف فریضۂ تبلیغ ہی بہترین صُورت سے انجام پائے گا بلکہ ہمارے سینکڑوں دینی امراض کو بھی خُود بخود شفا ہو جائے گی۔

اِصلاحِ حال کیلیے چند عملی تدابیر

ان مختلف اِصلاحی تدابیر میں سے چند تدبیریں جو دیگر ممالک کے تبلیغی تجربات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے خیال میں اشاعتِ اسلام کے لیے مفید ہیں ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ اُمید ہے کہ زُعمائے مِلّت اِن پر غور کریں گے :

ا ۔ ذات پات اور عدم مساوات کا خاتمہ :

مُسلمانوں میں سے ذات پات کے اُس امتیاز کو مِٹا دیا جائے جو ہندوؤں کی ہمسائگی سے اُن کے اندر پیدا ہوگیا ہے۔ اِسلام کا یہ مُساوات پرور عقیدہ کہ کوئی اِنسان اپنی خِلقت کے اعتبار سے نجس یا ذلیل نہیں ہے ہمیشہ اس کی کامیابی کا بڑا ذریعہ رہا ہے اور ضرورت ہے کہ ہم دوبارہ اِس کو اپنے تمام مُعاملات میں ایک بُنیادی اصُول کی حیثیت سے داخل کرلیں۔

ب ۔ نسبی امتیازات کا خاتمہ :

ہمارے ہاں عام طور پر نو مُسلموں کو نسبی مُسلمانوں کے مقابلے میں ادنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ اِس غیر اسلامی عقیدے کا سختی کے ساتھ اِستیصال کردینا چاہیے اور نو مُسلم عورتوں اور مردوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرنے کی رسم دوبارہ زندہ ہونی چاہیے۔ ہمارے ہاں کے شُرفا اِس سے پرہیز کرتے ہیں مگر ہم میں کا کوئی شریف ترین آدمی بھی رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مقابلے میں اپنی شرافت کو پیش نہیں کرسکتا جنھوں نے دو نو مُسلموں یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عُمر فارُوقؓ کی بیٹیاں لی تھیں اور

دونو مسلموں، یعنی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو اپنی بیٹیاں دی تھیں۔

ج ۔ اخوتِ اسلامی کا فروغ :

مسلمانوں میں اخوتِ اسلامی کے جذبہ کو ترقی دینی چاہیے تاکہ غیر مسلموں کو اسلامی برادری میں داخل ہونے کا شوق پیدا ہو۔

د ۔ عام دینی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح :

اگر مسلمانوں کی اندرونی زندگی کی اصلاح کسی عمیق تحریک کی محتاج ہو تو کم از کم ان کی ظاہری زندگی میں ایسی اسلامی کشش پیدا کرنی چاہیے کہ غیر مسلم قومیں خود بخود ان کی طرف کھنچنے لگیں۔ مثلاً نماز باجماعت اور روزوں کی پابندی، مشرکانہ رسوم و بدعات سے احتراز اور منہیاتِ شرعیہ سے پرہیز کی عام تلقین کی جائے اور خصوصاً مسلمانوں میں اخلاقی جرائم کے استیصال کی سخت کوشش کی جائے، کیونکہ جب مسلمانوں کا اخلاقی درجہ بلند ہوگا تو غیر مسلموں کے دل میں ان کی عظمت قائم ہو جائے گی۔

ہ ۔ مذہبی مسائل کی تعلیم اور تبلیغی سرگرمیوں کی تحریک و ترغیب :

جمعہ کے مواعظ، شبینہ مجالس و مدارس اور عام رسائل کے ذریعے مسلمانوں کو مذہبی مسائل کی تعلیم دی جائے۔ تقابلِ ادیان کے معمولی مباحث نہایت وضاحت کے ساتھ بتائے جائیں اور ان کے اندر تبلیغ کا شوق پیدا کیا جائے خصوصیت کے ساتھ مدارس کے اساتذہ، سرکاری محکموں کے ملازموں اور عام کاروباری لوگوں میں اس تحریک کو پھیلانا بہت مفید ہے؛ کیونکہ انھیں عوام سے بہت زیادہ میل جول کا موقعہ ملتا ہے اور وہ بہت

کامیابی کے ساتھ تبلیغ کرسکتے ہیں۔

حرفِ آخر

یہ ایک نہایت زبردست کام ہے اور اس کو انجام دینے کے لیے ضرورت ہے کہ ہمارے علما اور سجّادہ نشین حضرات اپنے حجروں سے نکلیں۔ علما کا فرض تو ظاہر ہے کہ انھیں درجۂ "خشیۃ"[1] اور انبیائے بنی اسرائیل سے مشابہت جیسی فضیلتیں کچھ مُفت ہی نہیں مل گئی ہیں بلکہ ان پر اُمّت کی اصلاح و ہدایت کا ایک بہت بڑا بار رکھ دیا گیا ہے، جسے اٹھانے میں ذرّہ برابر بھی کوتاہی کرنے پر وُہ خدا کی شدید گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ مگر ہم حضراتِ صوفیائے کرام کو بھی اُن کا فرض یاد دلانا چاہتے ہیں۔ جن سجّادہ ہائے طریقت پر وُہ جلوہ فرما ہیں وُہ ارشاد و ہدایت کی مسندیں ہیں۔ اِن کی وراثت اپنے ساتھ صرف چند فضیلتیں اور دُنیاوی فوائد ہی نہیں رکھتی بلکہ وُہ بہت سی ذمّہ داریاں اور بہت سی مسئولیتیں بھی رکھتی ہے، جن کے احساس نے قُدمائے متصوّفین کو اسلام کی خدمت کے سوا اور کسی مطلب ہی کا نہ رکھا تھا۔ آج اگر یہ حضرات ان ذمّہ داریوں کو محسوس کرلیں جو ایک مسلمان سے بیعت لینے کے بعد اس کی اصلاح و تزکیۂ نفس کے لیے اُن پر عائد ہوتی ہیں تو مسلمانوں کے سینکڑوں مصائب کا علاج ہوسکتا ہے۔ بڑے بڑے سجّادہ نشینوں اور پیرانِ طریقت کا حلقۂ ارادت کم از کم کروڑ

---

[1] اس آیۂ قرآنی کی طرف اشارہ ہے: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۸)
ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف (صفاتِ الٰہی کا) علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔

ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں[1] پر مشتمل ہے اور اس میں اُن کو ایسا زبردست اثر حاصل ہے کہ وہ اپنے ایک اشارے سے اُن کی زندگیوں کا نظام بدل سکتے ہیں۔ ایسی کثیر جماعت میں اسلامی خدمت کا جوش پیدا کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ چند ہی سال میں اس سرزمین کا نقشہ بدل جائے۔ تو کیا ہم یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ یہ حضرات اپنے کاشانۂ امن و عافیت سے نکل کر اِس نازک وقت میں کچھ خدا اور اُس کے دینِ برحق کے لیے بھی دوڑ دھوپ کریں گے؟

---

[1] یہ اندازہ ۱۹۲۵ء کا ہے، اب صورتِ حال یقیناً اس سے مختلف ہے۔

حصّۂ دوم

اسلام پر کفر کی یورش کے اسباب

بنگال کے مسیحی مبلّغین نے اپنی ایک کانفرنس میں مسلمانانِ بنگال کو مسیحیت کی دعوت دینے کے متعلق جو تجویزیں منظور کی ہیں وہ اخبارات میں چھپ چکی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ قارئین کرام میں سے کتنے ان سطور کو پڑھ کر کچھ اچنبھے اور کچھ رنج کی سی کیفیت ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہوں گے اور کتنے ان سے سبق لے کر آمادۂ عمل ہوئے ہوں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب ہماری شور پسندی ایک مرض کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اب ہم اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ جب کبھی مخالفین کے کسی بڑے حملے یا خاص منصوبے کی ہم تک اطلاع پہنچتی ہے تو دفعتاً چونک پڑتے ہیں اور ایک بدحواسی اور اضطراب کے عالم میں کچھ دفاع کی غیر مرتب سی تدبیریں اختیار کرنے لگتے ہیں اور جب خطرہ ذرا کم ہو جاتا ہے تو مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ عیسائی مشنریوں اور آریہ پرچارکوں[1] کو اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہوئے پچاس سال سے

---

[1] "آریہ پرچار" نہ صرف ۱۹۲۵ء میں برسرِ کار تھا بلکہ آج بھی بھارت میں مسلمانوں کو شدھی کرنے کی تحریک اسی طرح جاری ہے۔ (نیازی)

زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اس طویل مدت میں وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے ہیں اور کوئی سال ایسا نہیں گزرا جس میں اُنھوں نے اپنے ہم مذہبوں کی تعداد میں اضافہ نہ کیا ہو لیکن ہم نے ہمیشہ اُن کی خاموشی کو اپنی طرح بے عملی کا ہم معنی سمجھا اور کبھی اپنے بچاؤ کی تدبیر نہ کی۔ ہماری مثال بالکل مارب[1] کے اُن دیہاتیوں کی سی ہے جو اپنے آباؤ اجداد کے بنائے ہوئے بند کو دیوتاؤں کا بنایا ہوا بند سمجھتے تھے اور اس میں کسی کمزوری یا بوسیدگی کے قائل نہیں تھے۔ جب چوہوں نے اس میں آہستہ آہستہ سوراخ کرنا شروع کیا تو وہ سمجھے کہ یہ معجزے سے بنایا ہوا بند اِن چوہوں کے بس کا نہیں ہے۔ مگر وُہی چوہے برسوں کی لگاتار کوشش کے بعد اس حد تک کامیاب ہو گئے کہ اس میں سے پانی رِسنے لگا۔ آخر کُچھ پانی کے زور نے اثر دکھایا اور کُچھ دیواروں کی بوسیدگی رنگ لائی اور دفعتاً بند ٹوٹ کر ایسا سیلاب آیا کہ دُور دُور تک کی بستیاں تباہ ہو گئیں۔ یہی حال ہمارا بھی ہے۔ ہمیں اس بات پر تو اعتماد ہے اور ہونا چاہیے کہ اسلام کا بند بہت مضبوط ہے جسے کوئی توڑ نہیں سکتا لیکن ہم نے خود اپنی غفلت سے اسے بوسیدہ کر لیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وُہ بے حقیقت چوہے جن کے دانت فی الحقیقت چنے سے بھی زیادہ کمزور ہیں اس میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کامیاب ہو رہے ہیں۔

---

[1] مارِب: قدیم ملکِ سبا کا دار الحکومت، جس کے قریب برساتی نالوں پر بند باندھ کر ایک بہت بڑا تالاب بنا لیا گیا تھا۔ اسی پر پُورے ملک کی زراعت کا انحصار تھا۔ چوہوں کے سوراخ کر دینے کی وجہ سے اس تالاب کا عظیم الشّان بند ٹوٹ گیا اور سارے ملک کا نظامِ آبپاشی تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

دُوسروں کی کامیابی ہماری نا اہلی کا ثمر ہے

ہمیں سوچنا چاہیے کہ آخر وُہ کیا چیز ہے جس کی بنا پر آریہ اور عیسائیوں کو ہمارے مقابلے میں آنے کی جرأت ہوتی ہے۔ اُن کے مذہب کو دیکھیے تو وُہ ایسے خُرافات کا مجمُوعہ ہے کہ وُہ اسے ہمارے سامنے پیش کرنا تو درکنار خُود بھی جب کبھی سنجیدگی کے عالم میں غور کرتے ہوں گے تو شرماتے ہوں گے۔ پھر آخر کوئی بات تو ہے کہ وُہ اپنی اس متاعِ بے حقیقت کو لے کر بازار میں آتے ہیں اور کامیاب و بامُراد جاتے ہیں۔ اِس سوال کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اُن کی یہ کامیابی کُچھ ان کی قابلیّت سے نہیں بلکہ ہماری نا قابلیّت کی رہینِ منّت ہے۔ ان کی دُکان کا فروغ کُچھ اِس لیے نہیں ہے کہ ان کی متاع اچھّی ہے اور بازار میں اُس کی مانگ ہے بلکہ وُہ صِرف اِس لیے بِک رہی ہے کہ ہم نے اپنی متاع کی قدر کھو دی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ کوئی شخص اگر ایک دفعہ نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو جائے تو دُنیا کی کوئی قوّت اُسے دینِ حق سے پھیرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن جب وُہ نعمت پیش ہی نہ کی جائے، جب عام مُسلمانوں کا اسلام صرف روایتی اور مورُوثی اِسلام رہ جائے، جب اُنھیں جہالت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور وُہ اسلام کی خُوبیوں سے واقِف ہی نہ کیے جائیں تو اس کی مضبُوطی اور استحکام پر اعتماد اور اِس کے ناقابلِ تسخیر ہونے پر بھروسہ کیونکر کیا جا سکتا ہے، اور یہ بھروسہ اپنے آپ کو صحیح کیسے ثابت کر سکتا ہے!

خطرے کے حقیقی اسباب
اور
ہمارے دینی مصائب کے مستقل سرچشمے

پس اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ غیر مسلم مبلّغین کو مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے اور انھیں مرتد بنانے کی جس بنا پر جرأت ہوتی ہے وُہ خود ہماری اپنی کمزوریاں ہیں۔ جب تک ہم میں یہ کمزوریاں باقی رہیں گی یہ خطرہ بھی باقی رہے گا، اور ہمارے بدقسمت کان ہمیشہ یہ سُنتے رہیں گے کہ آج فلاں جگہ آریوں یا عیسائیوں کا حملہ ہُوا اور آج فلاں جگہ مسلم قوم اِرتداد کے خطرے میں مُبتلا ہے۔ وقت کے وقت اِن خطرات کے دفاع کی سطحی تدبیریں اختیار کرلینے اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنے سے یہ مُستقل روگ کبھی دُور نہیں ہوسکتا، بلکہ اِس سے تو یہ اندیشہ ہے کہ کچھ دن بعد ہم ایسے خطروں کی آوازیں سُننے کے عادی ہو جائیں گے اور اِس طرف توجّہ بھی کرنی چھوڑ دیں گے۔ اس کا اگر کوئی علاج ہے تو صرف یہی کہ ہم اپنی اصل کمزوریوں کا علاج کریں اور اُن کو دُور کرنے کے لیے مُستقل اور عملی تدبیریں اختیار کریں، تاکہ ہم میں سے وُہ چیز ہی دُور ہو جائے جو دُشمنوں کو اپنے اُوپر حملہ آور ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کمزوریاں صرف تین ہیں اور وُہی تمام خرابیوں کی اصل ہیں:

(۱) جہالت

ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جاہل ہے اور شریعتِ اسلام

سے اُس کی ناواقفیت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ وُہ کلمہ گوئی کی حدُود سے بھی خارج ہو گیا ہے، بلکہ عُرفِ عام میں یُوں کہنا چاہیے کہ نام کا مسلمان بھی نہیں رہا، اس لیے اُسے ہر مذہب کے لوگ آسانی کے ساتھ اِسلام سے پھیر سکتے ہیں

(۲) افلاس :

دُوسرے یہ کہ مُسلمان حد سے زیادہ مُفلِس ہیں اور ان کا افلاس جہالت سے مِل کر ان کے اندر سرمایہ دار مُبلّغین کے دام میں گرفتار ہونے کی استعداد پیدا کر دیتا ہے۔

(۳) مشنری مدارس :

تیسرے یہ کہ مُسلمانوں کے لڑکے اپنے قومی مدارس[1] نہ ہونے کے باعث مِشنری مدارس میں داخل کر دیے جاتے ہیں اور وہاں اُن کی لوحِ سادہ پر بچپن ہی سے مسیحیت کا نقش بیٹھ جاتا ہے جو آگے چل کر بعض اوقات خُفیہ اور بعض اوقات عَلانیہ اِرتداد کی صُورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ ہمارے دینی مصائب کے مستقل سرچشمے ہیں۔ ان کی پیدائش کے اسباب اِس قدر کثیر التعداد ہیں کہ نہ تو ان کا پُوری طرح احصا کیا جا سکتا ہے اور نہ اس جگہ ان پر کوئی مفصل بحث کی جا سکتی ہے۔ تاہم اگر اُن پر مجموعی حیثیت سے ایک

---

[1] ۱۹۲۵ء کے حالات کے مطابق "قومی مدارس" نہ ہونے والی بات صحیح اور مناسب تھی لیکن آج قومی مدارس کثیر تعداد میں موجود ہونے کے باوجود مُسلمان لڑکے مشنری اسکولوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب صرف قومی مدارس کی کمی ہی عِلّتِ غائی نہیں ہے بلکہ اس مرض کی جڑ مغرب پرستی اور مذہبی تعلیم کی کمی ہے۔ اسکول میں داخلے سے پہلے مکتب یا گھر پر قرآن کی ابتدائی تعلیم ضروری ہے۔ (نیازی)

نظر ڈالی جائے تو بر بنائے استخراج ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں چند اسباب اصل و بُنیاد کا حکم رکھتے ہیں :

مثلاً مسلمانوں کی محکومی، علماٗ کی غفلت، مُسلمانوں کی معاشرت میں غیر اسلامی طریقوں کا رواج، مُسلمانوں کے فوائے ملّی کا غیر معمولی انتشار اور مسلمانوں میں سرمایہ کی قوّت کا عدمِ احساس، جو افلاس میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

ہماری سادگی اور کوتاہ اندیشی

اور

مخالفین کی عیّاری اور تدبّر

اِن کمزوریوں اور ان کے اسباب میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ جسے ہم دُوسروں کی طرف منسوب کر سکتے ہوں یا جس کا منبع ہمارے مخالفین کے اندر موجُود ہو۔ پھر اگر ہم اُن کے مقابلے پر پروپیگنڈا کریں یا مجالسِ مذاکرہ منعقد کریں یا کبھی اِرتدادزدہ علاقوں میں چکّر لگانے کے لیے اپنے مُبلّغین بھیج دیا کریں، جیسا کہ اب تک ہمارا طریقہ کار رہا ہے تو یقیناً یہ مرض کا اصل علاج نہیں ہوسکتا، اور نہ اِس سے یہ آئے دن کے روگ کسی طرح دُور ہو سکتے ہیں۔ اگر ہمارے مخالفین کا طریقہ کار بھی یہی ہوتا تو شاید اُن کے مقابلے میں اِن طریقوں سے ہم کامیاب ہو سکتے۔ لیکن اُنھوں نے تو پروپیگنڈا اور وعظ و تلقین کو صرف ہمیں مشغول رکھنے کے لیے حیلہ بنا رکھا ہے ورنہ دراصل اُن کے طریق کار بالکل ہی مختلف ہیں۔ وہ

ہماری سیاسی و اقتصادی غلامی، ہمارے علماء کی غفلت، ہماری قوتوں کے انتشار، ہماری اپنے مذہب سے عام ناواقفیت اور ہماری تمام دوسری کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انھوں نے ہزاروں شفاخانے قائم کر رکھے ہیں، جہاں خدمتِ بنی نوعِ انسان کے پردے میں وہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ جاہل مریضوں کو اپنے مذہب کی تلقین کرتے ہیں۔ انھوں نے ہزاروں یتیم خانے کھول رکھے ہیں جہاں بے شمار یتیم اور لاوارث بچوں کو مسیحیت کی گھٹی پلائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے انتظامات ایسے مکمل کر رکھے ہیں کہ جہاں کہیں قحط پڑتا ہے یا اور کوئی آسمانی بلا نازل ہوتی ہے تو تمام بے خانماں لوگوں کو پناہ دیتے ہیں اور روٹی کپڑے کے احسان کی صورت میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں ہزارہا مدرسے اور کالج قائم کر رکھے ہیں جہاں نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ بچوں کو ارتداد کی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے اندر اس قدر صبر و استقامت، اس قدر ایثار و خدمت اور اس قدر سچا مذہبی شغف پیدا کیا ہے کہ وہ برسوں ایک ایک مقام پر ترک و تجرد کے عالم میں بسر کر دیتے ہیں۔ فقیروں اور جوگیوں کی سی زندگی اختیار کرتے ہیں اور نہایت خاموشی کے ساتھ لوگوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان میں اس قدر عقل و تدبر موجود ہے کہ اگر خالصتاً نہیں تو کم از کم تصنع کے ساتھ وہ لوگوں کے سامنے ایسی سادہ اور ایسی پرہیزگارانہ اور ایسی بہتر اخلاقی زندگی کا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ ان کی زبان و قلم سے زیادہ خود ان کی زندگی ہی ایک مستقل ذریعۂ تبلیغ بن جاتی ہے اور پھر ان سب باتوں کے ساتھ ہمارے مخالفین

کے ایک گروہ میں یہ عیاری بھی بدرجۂ اُتم موجود ہے کہ وہ ہمارے موجودہ افلاس سے فائدہ اُٹھا کر ہم پر اقتصادی دباؤ ڈالتے ہیں اور رُوپے کی قوت سے اپنے مذہب کی اشاعت میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ طریقے کس قدر عمیق اور کارگر ہیں۔ ان کی مثال بالکل ایک سیلاب کی سی ہے جو ایک ہی وقت میں شور بھی مچاتا ہے، عمارتوں کو تہ و بالا بھی کرتا ہے اور سیل بن کر بڑے بڑے ایوانوں کی بنیادیں بھی ڈھا دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں نہ معمولی تختہ بندی کام دے سکتی ہے اور نہ محض لیپا پوتی۔ اس کے لیے تو ضرورت ہے کہ ہم بھی اتنے ہی عمیق اور کارگر ذرائع اختیار کریں جتنے ہمارے مخالفین نے اختیار کر رکھے ہیں ورنہ مدافعت میں ہمارا کامیاب ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔

تدابیرِ دفاع

ہم اُن خطرات اور اندرونی کمزوریوں پر بحث کر چکے ہیں جن سے خاکم بدہن ہندوستان[1] میں اگر اسلام کے فنا ہو جانے کا نہیں تو کم از کم غریب و ستم دیدہ ہو جانے کا قوی اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہم نے اختصار کے ساتھ قارئین کے سامنے ان عمیق اور نہایت کارگر تدابیر کا بھی ایک خاکہ کھینچ دیا ہے جو اسلام کے مخالف اس کی قوت کو توڑ دینے کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور یہ واضح ہو گیا ہے کہ ہم بھی جب تک اتنی ہی عمیق اور کارگر تدابیر اختیار نہیں کریں گے اُس وقت تک ہمیں اسلام کی حفاظت اور اشاعت میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اب ہم اس مسئلے پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں کہ دفاع کے لیے ہمیں کیا کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئیں اور ہمارا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے۔

---

[1] مراد ہے تقسیم سے قبل کا ہندوستان

۱۔ تعلیماتِ اسلامی کی عام اشاعت

اور

مذہبی شعور کی بیداری

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ ہماری سب سے بڑی کمزوری جہالت ہے۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ اپنے مذہب کی تعلیمات، اس کے عقائد اور شعائر سے یکسر جاہل ہے اور یہی چیز ہے جو اعداء کو اسے مرتد بنانے میں سب سے زیادہ مدد دیتی ہے۔ پس اس لحاظ سے ہماری پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم ہندوستان[1] کے تمام جاہل مسلمانوں میں تعلیماتِ اسلامی کی اشاعت کریں۔ اسلام کے سادہ عقائد ان کے ذہن نشین کر دیں اور ان کے اندر اس حد تک مذہبی روح پیدا کر دیں کہ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو جائیں۔ اس کے لیے ہم کو عام طور پر دیہات و قصبات میں ایک ایک شخص ایسا مقرر کرنا چاہیے جو عوام کو ان کے فرصت کے اوقات میں نہایت تدریج کے ساتھ مذہبی تعلیم دے سکے اور خود انہی کی زبان میں انھیں اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کرتا رہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں غیر مسلموں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دی جا سکتی ہے مگر اس وقت ہماری تمام تر توجہ کافروں کو مسلمان بنانے کے بجائے خود مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی طرف مبذول رہنی چاہیے۔ ان کی سوئی ہوئی مذہبیت کو جگا دینے کے بعد جب ہم ایک دفعہ اپنے اندرونی استحکامات کو تمام بیرونی حملوں کے خطروں سے محفوظ کر لیں گے تو پھر

[1] مراد ہے تقسیم سے قبل کا ہندوستان، یعنی موجودہ پاکستان اور بھارت۔

ہمیں دُوسروں کی طرف رُخ کرنے کا زیادہ موقعہ مِل سکے گا۔

۲۔ مکاتِب کا قیام

اس کے ساتھ ہی دُوسری چیز یہ ہے کہ مُسلمان بچّوں کو ابتدائی دینی تعلیم دینے کے لیے گاؤں گاؤں میں مکاتب قائم کر دیے جائیں۔ اس کے لیے بھی کسی لمبے چوڑے نظام اور کسی خاص درسی نصاب کی ضرورت نہیں۔ انھیں مُسلمان بنانے کے لیے ابتداً صرف اتنا کافی ہے کہ نہایت سادگی کے ساتھ اسلامی عقائد اُن کے ذہن نشین کر دیے جائیں۔ وضو، استنجا، نماز، روزہ وغیرہ کے متعلق معمولی مسائل یاد کرا دیے جائیں اور قرآن مجید پڑھا دیا جائے۔ قرآن مجید کو محض طوطے کی طرح پڑھ لینا ہی انسان پر اتنا اثر کرتا ہے کہ اسلام کی عظمت دِل میں بیٹھ جاتی ہے اور پھر مشکل ہی کوئی چیز اسے زائل کر سکتی ہے۔ پس اگر ہم اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنے بچّوں کو کوئی کارآمد تعلیم دے سکیں تو کم از کم اُن کی لوحِ سادہ پر قرآن کا گہرا نقش تو ضرور بٹھا دینا چاہیئے تاکہ اِن پر کُفر کا جادُو نہ چل سکے۔

یہ وُہ کم سے کم کام ہے جسے انجام دینے میں ہمیں ذرّہ برابر بھی توقف نہ کرنا چاہیے۔ اس کے لیے سفری مبلّغین کارآمد نہیں ہو سکتے بلکہ ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو مستقل طور پر ایک مقام پر رہ پڑیں اور آریہ مشنریوں کی طرح دیہاتی زندگی کی تکلیفیں برداشت کر کے پُورے عزم و استقلال کے ساتھ دین و ملّت کی خدمات انجام دیں۔ ان میں اتنی استقامت ہونی چاہیے کہ کامیابی کے ساتھ لوگوں کی جاہلانہ فطرت

کا مقابلہ کر سکیں۔ اوّل اوّل کی ناکامیوں سے ہمت نہ ہاریں۔ مشرکانہ عقائد اور رسوم و بدعات کو دُور کرنے میں اگر کئی کئی برس بھی لگ جائیں تو بد دل نہ ہوں اور جلد بازی کر کے جہالت سے جنگ نہ کریں۔ بلکہ آہستہ آہستہ وعظ و تلقین اور تعلیم و تبلیغ کے ذریعے طبیعتوں کو اصلاح کی طرف مائل کریں۔ اس کے ساتھ ہی ان میں قربانی کا اتنا جذبہ بھی ہونا چاہیے کہ وہ اس مُفلس قوم سے اپنی دینی خدمات کا کم سے کم معاوضہ لے سکیں جو عیسائی مشنریوں کی طرح کروڑوں روپیہ پانی کی طرح نہیں بہا سکتی، اور اُن کے اخلاق میں اتنی پاکیزگی بھی ہونی ضروری ہے کہ سادہ لوح دیہاتیوں کو اپنے اعمال سے برگشتہ کر دینے کے بجائے انھیں اپنے حُسنِ خُلق کا گرویدہ بنا لیں اور خُود اپنے اندر اسلامی زندگی کا ایسا نمونہ پیش کریں کہ لوگ ان سے اسلامی تعلیمات کا عملی سبق حاصل کر سکیں۔

۳۔ طبعی حوادث کے اثرات سے بچانے کیلیے مُحتاج خانوں اور یتیم خانوں کی مُستقل تنظیم

اس کے بعد دُوسرا درجہ یہ ہے کہ ہم مُسلمانوں کو اس قسم کے طبعی حوادث کے اثرات سے بچانے کے لیے انقطاعی نظام قائم کریں جو انھیں عیسائی مشنریوں اور آریہ پرچار کرنے والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً قحطوں اور سیلابوں کے موقعہ پر ہزار ہا مرد، عورت اور بچے بے خانماں ہو جاتے ہیں، جنھیں کوئی پناہ دینے

والا نہیں ہوتا اور مجبوراً انھیں اپنی متاعِ دین و ایمان کے عوض سرمایہ دار مشنریوں سے پیٹ بھر روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح رات دن جن بچوں کا کوئی والی و وارث نہیں ہوتا محض اس وجہ سے آوارہ پھرتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے اور اس طرح اکثر انھیں عیسائی یا آریہ یتیم خانے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ یہ ارتداد کے دائمی شکار ہیں جنھیں محض مسلمانوں کی غفلت اسلام کی گود سے چھین کر کفر کی آغوش میں ڈال دیتی ہے۔ انھیں اس خطرہ سے بچانے کے لیے محتاج خانوں کی مستقل تنظیم ضروری ہے، اور اس کے لیے یہی لازم نہیں کہ کوئی بہت بڑے پیمانے پر انتظام قائم کیا جائے بلکہ ایسا ممکن نہ ہو تو صرف اتنا انتظام کافی ہے کہ انھیں مشنریوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچایا جائے۔ یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے کہ انھیں کام دینے اور دنیا میں کچھ کر کے کھانے کے قابل بنانے کی کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ فی الحال ہمارا نقطۂ نظر صرف ان کے اسلام کی حفاظت ہونا چاہیے اور یہ اسی طرح ہو سکتی ہے کہ انھیں پناہ دے کر ایسے مسلمان خاندانوں کی خدمت میں دے دیا جائے جو انھیں غلاموں کی طرح نہیں بلکہ قابلِ رحم خدمت گاروں کی طرح پرورش کر سکیں۔ یا اگر کچھ ہنرمند ہوں تو کسی کار سے لگا دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یتیموں اور محتاجوں کا یہ حشر کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے، لیکن اگر ہماری قوم میں اتنا احساس نہیں ہے کہ وہ اپنے نونہالوں کی پرورش کا کوئی بہتر انتظام کرنے کے اسباب بہم پہنچائے تو ہمیں حسبِ ارشادِ نبویؐ ولبلاؤں

لہ: حدیثِ مذکور سے یہ شرعی قاعدہ اخذ کیا گیا ہے کہ جب دو ناجائز (یا ناپسندیدہ) کاموں میں سے کسی ایک کا اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے تو ان میں سے وہ اختیار کیا جائے جو کم تر درجے کا ناجائز (یا ناپسندیدہ) کام ہو۔ اس قاعدے کو اِختیارِ اَھْوَنُ البَلِیَّتَین کا نام دیا گیا ہے۔

میں سے ایک چھوٹی بلا کو قبول کرنا چاہیے اور یقیناً ایک مسلمان بچے کا مسلمان رہ کر خدمت گار بن جانا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ کفر کا طوق گلے میں ڈال کر بیرسٹر بن جائے۔

۴۔ مشنری تعلیمی اداروں کا مقاطعہ

ایک اور ضروری تدبیر یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کو مشن اسکولوں اور کالجوں سے اٹھانے کی ایک باقاعدہ تحریک شروع کی جائے۔ اِن مدارس کا مقصد علم وفن کی روشنی پھیلانا نہیں ہے بلکہ بچوں کو ان کے مذہب سے پھیر کر سینٹ پال کے خود ساختہ مذہب کی دعوت دینا ہے، اور عام طور پر اُن کی تعلیم کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر طلبہ علانیہ مرتد نہیں ہوتے تو کم از کم اپنے مذہب سے برگشتہ ضرور ہو جاتے ہیں۔ ان کے دل میں اسلام کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ اسلامی عقائد سے صریحاً انحراف پیدا ہو جاتا ہے۔ عبادات کو کھیل سمجھنے لگتے ہیں۔ اسلامی شعائر کی کھلی کھلی توہین کرتے ہیں اور صرف خاندانی قیود اور رسمی مزاحمت کے باعث اسلام کے ساتھ اُن کا رشتہ برائے نام رہ جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بقول مسٹر آرنلڈ مشنری مدارس کی تعلیم نے بعض اوقات بالکل اُلٹا اثر بھی کیا ہے اور بعض طلبہ مرتد ہونے کے بجائے مسیحیت کی کمزوریوں سے واقف ہو کر اُس کے زبردست حریف بن گئے ہیں، مگر ایسی سعید روحیں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر تو مشنری مدارس کے طلبہ کی وہی حالت دیکھی جاتی ہے جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اور یقیناً انھیں اس بے دینی کے خطرے سے نکالنا ایک عظیم خدمتِ دینی ہے۔

اس تحریک کے خلاف یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ پہلے ہی مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے اور اس کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں ہے، اس پر اگر مشنری مدارس کا بھی بائیکاٹ کر دیا جائے تو پھر ہمارے بچے آخر کہاں پڑھیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اوّل تو مشنری مدارس کی کمی کو سرکاری اور اسلامی مدارس مل کر پورا کر سکتے ہیں، جن کی تعلیم اُن سے بدرجہا زیادہ قابلِ ترجیح ہوتی ہے، لیکن اگر وہاں بھی اس کی تلافی ممکن نہ ہو تو ایک سچے مسلمان کے نقطۂ نظر سے مذہب کو اعلیٰ تعلیم پر کسی طرح قربان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مشنری مدارس کے سوا مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوئی ٹھکانہ میسّر نہ آئے تو اسے قبول کرنے سے اس کو ٹھکرا دینا زیادہ بہتر ہے؛ کیونکہ ہمارے بچوں کا اسلام سے پھر جانا اُن کے جاہل رہ جانے سے زیادہ بڑی مصیبت ہے۔ پس ضرورت ہے کہ مشنری تعلیم گاہوں کے خلاف پوری سرگرمی کے ساتھ پروپیگنڈا کیا جائے اور صرف پروپیگنڈا ہی نہیں بلکہ عملاً ہر مسلمان کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے بچوں کو ان مدارس سے اُٹھا لے۔

۵۔ اقتصادی غلامی سے نجات

آخری اور موجودہ حالات میں سب سے زیادہ ضروری تدبیر یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُن کی موجودہ اقتصادی غلامی سے نکالا جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اقتصادی فلاح کا سب سے بڑا ذریعہ حکومت تھی۔ اُن میں تجارت اور سرمایہ داری کا ذوق کبھی نہ تھا، صرف ایک صنعت و حرفت کا قدرتی ذوق موجود تھا، سو اس کے فوائد کا

انحصار بھی حکومت اور متوسلین حکومت کی قدر دانیوں پر تھا۔ جب یہ حکومت چلی گئی تو ان کی خوش حالی اور دولتمندی کا سرچشمہ بھی سوکھ گیا، اور اب یہ حالت ہے کہ جتنے صنعت و زراعت پیشہ مسلمان ہیں سب کے سب سرمایہ دار ہندوؤں کے غلام ہیں اور جنہیں اللہ نے آبائی ثروت عطا کی ہے وہ اپنے بگڑے ہوئے نظامِ تمدن اور اپنی غلط مسرفانہ عادات کے باعث روز بروز اُسے قرض داری کی نذر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اِس اقتصادی غلامی کا یہ اثر ہے کہ کاروباری زندگی میں ہندوؤں کی قوت مسلمانوں کے لیے مہلک حد تک بڑھ گئی ہے اور وہ یہاں تک اُن پر چھا گئے ہیں کہ جس وقت چاہیں ایکا کر کے مسلمانوں کو تباہ کر دیں۔ شہروں اور بڑے بڑے قصبات میں تو یہ صرف اقتصادی غلامی ہی تک محدود ہے مگر دُور دراز کے دیہات میں یہی چیز ارتداد کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار بن گئی ہے اور غیر مسلم مبلغین پوری مستعدی کے ساتھ جاہل مسلمان دیہاتیوں کو مرتد بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پس حفاظتِ اسلام کے لیے اِس بیماری کا علاج بھی نہایت ضروری ہے، بلکہ شاید موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ اس وقت جو چیز ہندوستان[1] میں اِسلام کے وجود کو دھمکی دے رہی ہے وہ یہی اقتصادی خطرہ ہے۔

یا چناں کُن یا چنیں!

یہ ایک مستقل بحث ہے کہ مسلمانوں کو اِس خطرے سے بچانے کے لیے

---

[1] غیر منقسم ہندوستان مراد ہے۔

کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور اس پر یہاں بحث کرنے کی گنجائش بھی نہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس عظیم الشان کام کو انجام دینے کے لیے ہماری قوتوں کا موجودہ انتشار اور ہماری قومی جماعتوں کا موجودہ انتراق کسی حیثیت بھی موزوں نہیں ہے۔ ہم ابھی تک ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجدیں قائم کرنے میں مشغول ہیں اور یہاں پوری قوم کی متحدہ قوت درکار ہے۔ ہمیں ابھی تک ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور یہاں برسوں کی لگاتار اور انتھک محنتوں کی ضرورت ہے۔ ہم کو ابھی تک سطحی شور اور ہنگامے میں مزا آتا ہے اور یہاں دراصل مقصد کا گہرا شعور اور اُس کے لیے حقیقی اخلاص و ایثار مطلوب ہے۔ ہمیں ابھی تک صرف آگ کی طرح بھڑک کر جلا دینا آتا ہے، مگر یہاں اس کی حاجت نہیں ہے، اب تو ہمیں ایسی ہلکی سی حرارت کی ضرورت ہے جو برسوں تک اندر ہی اندر پکا کر لعل و گوہر تیار کر دیتی ہے۔ پس تمام تدبیریں اور تمام تجویزیں اس وقت تک بے کار ہیں جب تک ہم کو کام کرنے کا صحیح ڈھنگ نہ آجائے۔ اگر تحریکات میں یہی جذبہ برابر کام کرتا رہے اور اگر ہم دوسروں سے مقابلے کے بجائے آپس کے مکابرہ ہی میں بدستور مشغول رہیں، اور اگر ہمارے تمام کام اجتماع و اختلاف کے اسلامی اصول کے بجائے افتراق کے خالص غیر

اسلامی اُصول پر چلتے رہیں، تو پھر بہتر ہے کہ یہ تمام اسکیمیں لپیٹ کر رکھ دی جائیں اور ایک دفعہ ہم سب یہاں اسلام کے مستقبل کی فاتحہ پڑھ کر اپنے اپنے دِل پسند مشاغل میں مصروف ہو جائیں۔

پس اے معمارانِ حرم!

جس طرح ایک عمارت تیار کرنے کے لیے اچھے ساز و سامان سے زیادہ معماری کی اعلیٰ قابلیت درکار ہوتی ہے، اسی طرح ہمیں مُفید تدبیروں اور کار آمد تجویزوں سے زیادہ کام کرنے کی صلاحیّت درکار ہے۔ دَوا خواہ کتنی ہی مُفید اور کارگر ہو لیکن اگر طبیب میں علاج کرنے کی قابلیّت نہ ہو تو وُہ مریض کے لیے کچھ بھی مُفید نہیں ہو سکتی۔ پس اگر ہماری قوم کے اربابِ حلّ و عقد وقت کی نزاکتوں کو ٹھیک ٹھیک محسوس کرتے ہیں تو اُنھیں تمام دُوسرے ملحُوظات کو نظر انداز کر کے سب سے پہلے تنظیمِ قُوائے مِلّی کی طرف توجّہ کرنی چاہیے اور جلد سے جلد اِس طوائفُ الملوکی کا خاتمہ کر دینا چاہیے جو اِس وقت ہماری تمام قومی تحریکوں میں جاری و ساری ہے۔



نومبر ۱۹۶۷ء

داعی اور دعوت

"تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ جنگ میں بھی دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھا ہے۔ مسلمان کسی حالت میں بھی اپنے اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا کہ وہ خلقِ خدا کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف بلائے۔ یہ دعوت الی اللہ کا کام مسلمان اور اس کی زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ دعوتِ الی اللہ کا مقصود حاصل اُسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ ہم عملی زندگی کی رزمگاہ میں اس دعوت کو جاری رکھیں۔ ہم میں اور عیسائی مشنریوں میں فرق یہی ہے کہ وہ کچھ پیشہ ور مشنری ہوتے ہیں جو تبلیغ کا کام کرتے ہیں لیکن مسلمان کی تبلیغ رزمگاہِ حیات میں ہوتی ہے۔ یہ تبلیغ کہیں الگ بیٹھ کر محض کسی واعظ کی حیثیت سے نہیں ہوتی بلکہ مسلمان اگر کسی منڈی میں بھی کام کرتا ہے تو ایک طرف تو وہ اپنا کاروبار کرتا ہے اور دوسری طرف لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلاتا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے اور جو کام بھی کر رہا ہے وہ ہر حالت میں داعی الی اللہ پہلے ہے اور باقی اور کچھ بعد میں۔"

[خطابِ جہلم ۱۴ نومبر ۱۹۶۰ء مطبوعہ ہفت روزہ آئین لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۶۸ء]

اِشاریہ

اشخاص اور ادارے

ا

ب

ن

و

ہ

ی



اِشاریہ

—مقامات—

ا

ت

ٹ

ج

